کشف وکرامات کے واقعات ہیں، کتاب کے شروع میں مولوی حامد خاں صاحب ہندی کے قلم سے تصوف
کی حقیقت پر ایک مقدمہ ہے جس میں اسلامی تصوف کو پیش کرکے اس کے متعلق بعض غلط فہمیوں کو دور
کیا گیا ہے، اور مولانا سید حبیب جعفر بن حبیب احمد عید روسی کے قلم سے عربی میں ایک مختصر دیباچہ ہے،
ترجمہ صاف اور سلیس ہے، جو لوگ اس قسم کی کتابوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے ذوق کا اس تذکرہ میں
کافی سامان ہے،

عصمت کی کہانی۔ مولفہ جناب رازق الخیری صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ،
کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸؍ پتہ:۔ عصمت بک ڈپو، دہلی،

یہ اڈیٹر عصمت کے قلم سے رسالہ عصمت دہلی کے مختلف دوروں کی سرگذشت ہے، اس کے ضمن میں تمدن،
جوہر نسواں اور بنات وغیرہ ان تمام رسالوں کے حالات جن کا تعلق مولانا راشد الخیری مرحوم سے تھا، اور انکی
نسوانی وادبی خدمات اور اس کے لئے ان کے ایثار اور قربانیوں کی پوری تفصیل آگئی ہے،

خبطی۔ مولفہ جناب مجتبیٰ علی صاحب واحدی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸؍
پتہ:۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ،

اس افسانہ میں طالبعلمی کی زندگی کے بعض واقعات کو افسانہ کی شکل میں دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اسکا خلاصہ یہ ہوکہ
مہندر، سری، افتخار اور سرلا ہم سن طالبعلم ہیں، مہندر معمولی گھرانے کا لڑکا ہے لیکن ہونہار و شائستہ اور سری دولتمند دہقانی
خاندان کا بے عقل وبے شعور لڑکا ہے، سرلا ایک متمول گھر کی تعلیم یافتہ اور خوش مذاق لڑکی ہے، اسمیں اور مہندر میں مودت
ہوجاتی ہے لیکن سرلا کا باپ اس کی خوشی کے خلاف سری سے اسکی شادی کرنا چاہتا ہو سرلا انکار کرتی ہو اور مہندر سے شادی کرلیتی
ہے، ہونہار مولف نے طالبعلمی کی زندگی کے شوخ وشریر واقعات کی آمیزش سے اس افسانہ کو کافی دلچسپ بنادیا
ہے، مہندر کی اعلیٰ سیرت کی تصویر اور سری کی مضحک حرکتوں کا خاکہ بہت دلچسپ ہے، گو افسانہ سے کہیں کہیں نومشقی
ظاہر ہوتی ہے، لیکن ہونہار مولف میں افسانہ نگاری کی کافی صلاحیت ہے،

"م"

جلد ۴۶ ماہ جمادی الثانی و رجب المرجب ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات

مدیر نگار کی کیفیت علمی کا پردہ اب پہلی دفعہ فاش نہیں ہوا ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی بارہا فاش کیا جاتا رہا ہے، وہ کبھی مورخ، کبھی متکلم، کبھی ادیب اور کبھی شاعر بنکر لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پرانی شکل کے پہچاننے والے اب ان کی اس نئی شکل کو نہیں پہچان سکتے، مگر اہلِ نظر تاڑ جاتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں،

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

ان کی ہمیشہ سے یہ حالت رہی ہے کہ جب کبھی ان کو ہلدی کی کوئی گانٹھ ہاتھ آئی ہے انھوں نے استفسارات میں پنساری کی دکان کھول دی ہے،

مدیر نگار کی ساری تصنیفات اور تحریریں ملک کے سامنے ہیں، ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو ان کی دماغی کاوشوں کی ملکیت ہیں؟ ان کی سنجیدہ تصنیفات میں **صحابیات** ایک تصنیف ہے، مدت کی بات ہو لوگ بھول گئے ہوں گے مگر اب پھر یاد تازہ کی جاتی ہے کہ یہ سراسر دارالمصنفین کی کتاب سیر الصحابیات کی غارتگری سے مرتب کی گئی ہو، تاریخ تمدنِ حدیث بھی آپکے سرقات کی رہینِ منت ہو، ان کی ادبی تصنیفات میں شہاب کی سرگذشت بھی سنا ہے کہ ایک انگریزی تصنیف کا پورا چربہ ہے، ان کے استفسارات کا اچھا

حصہ الہلال مصر کے استفسارات کا سرقہ ہے، ان کے مسروقہ مضامین کی ایک فہرست سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے زمانہ ہیں چھپوائی تھی،

ابھی حال میں تاریخ ہند پر رسالہ نگار میں ایک مسلسل کتاب نہایت قابلانہ اور مدعیانہ تحقیق و تنقید کے ساتھ شائع کی گئی ہو، اور یہ باور کرانے کی ناجائز کوشش کی گئی ہو کہ گویا یہ تحقیقات مدیر نگار کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں، اور اصل فارسی ماخذوں سے لکھی گئی ہو، حالانکہ یہ پورا سلسلہ الیٹ کی انگریزی کتاب تاریخ ہند کے اقتباسات یا تلخیصات کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے، اب بھی جو چاہے نگار کے صفحات کو کھول کر الیٹ کے صفحات سے مقابلہ کرکے اس عہد کے سب سے بڑے "دزد بکف چراغ" کی دلاوری کو ملاحظہ کرسکتا ہو،

یہ ہو وہ شخصیتِ عظمیٰ جو قرآنِ پاک اور کلامی مسائل پر مدعیانہ رائے دینے کی جرأت کرتی ہے اور بیخبر نوجوانوں کو یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ وہ جو کچھ لکھتی ہے پورے ذمہ دارانہ غور و خوض کے بعد لکھتی ہے حالانکہ اسکی سطحی واقفیت علم و فن کے ظاہری حروف و نقوش سے بھی آشنا نہیں چہ جائیکہ قرآن پاک اور اسلام کے حقائق و اسرار کے فہم و استنباط کا دعویٰ،

اس علمی و ادبی شعبدہ باز نے اپنے مشہور خرافات کے بعد جس میں اس نے کمال ناز و تبختر و انانیت سے قرآن پاک کو خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہ (صلعم) کا کلام مانکر یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں سے ماخوذ بتایا تھا، اب اپنے چند نادان دوستوں کے مشورہ سے اشاعرہ و معتزلہ کے کلامی مسائل کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہو، یہ ہو ایک "کافرِ ادب" کی دوبارہ بزدلی کا مظاہرہ، افسوس کہ یہ شخص ایمان تو ایمان! کفر میں بھی پورا پکا ثابت نہیں ہوتا،

بحث یہ نہیں کہ خدا کو متکلم اس لئے کہتے ہیں کہ صفتِ کلام اسکی ذات کے ساتھ قائم ہے، یا اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کلام کا خالق ہے، اور نہ یہ بحث ہے کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا حادث، علم کلام کی یہ دقیق بحثیں مدیر نگار کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں، بلکہ بحث یہ ہے کہ اس نے یہ کہا ہے:

کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہونگے جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنھیں وہ مروجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی سے ادا کر دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا، اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے، عہد نبویؐ میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالہ سے یہود و نصارٰی کی طرف سے عام طور پر بیان کیجاتی تھیں، اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لئے رسول اللہ نے بھی انکو محض اعتبار و بصیرت کیلئے بیان کر دیا، اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط!! (نعوذ باللہ) یہ ہے موضوعِ بحث! جس سے اب مسلمانوں کے خوف سے کترانے کی خواہش کا فرار بزدلی ہے، اور جس کا کوئی تعلق کلامی مسائل سے نہیں ہے،

حالانکہ مدیر نگار کے دعوے یہ ہیں،

۱- کلام مجید رسول کا گھڑا ہوا کلام ہے، جو انکی ذہانت و طباعی اور تاثرات کا نتیجہ ہے،

۲- اسمیں انبیاے اسرائیل علیہم السلام کے قصے رسول اللہ صلعم نے یہود و نصارٰی سے سنکر قرآن میں داخل کر دیئے،

تو گویا رسول اللہ صلعم نے قرآن کے خدا کے کلام الٰہی ہونے پر جس قدر تحدی کی ہے، وہ سب افترا علی اللہ ہے، کیا اس سے زیادہ جھوٹ کی کوئی مثال ہو سکتی ہے، اور کیا کسی مسلمان کی حمیت اسکو سننے کی تاب لا سکتی ہے، عرب کے کفار اور موجودہ زمانہ کے نصارٰی اس کے سوا اور کیا کہتے ہیں؟

مقالات

فہمِ قرآن کے اصول و شرائط

(۲)

از

شاہ معین الدین احمد، ندوی،

تفسیر بالرائے کی وعید اور صحابہ اور تابعینؒ کی احتیاط

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ علمی نقطۂ نظر سے تھا، اب اس کو دوسرے پہلو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھئے، قرآن کی صحیح تفسیر و تاویل کے لئے رسول اللہ صلعم نے تفسیر بالرائے کی بڑی وعید فرمائی ہے، صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین عظام تفسیر میں کتنی احتیاط بلکہ کتنا خوف کرتے تھے اور تفسیر کی روایات ہمارے پاس کس احتیاط کے ساتھ پہنچی ہیں اس کا اندازہ آیندہ سطور سے ہوگا،

من قال فی القرآن برأیه فلیتبوّء مقعده من النار (بخاری) — جس نے اپنی راے سے قرآن میں کچھ کہا اس کو چاہئے کہ دوزخ میں ٹھکانے کے لئے تیار رہے،

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّء مقعده من النار، (ترمذی) — جس نے قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہا اس کو چاہئے کہ دوزخ میں ٹھکانے کے لئے تیار رہے،

ایک اور روایت میں ہے،

من قال برایہ فاخطاء فقد کفر، (ابوداؤد) جس نے اپنی رائے سے قرآن میں کہا اور غلطی کی تو کافر ہوگیا،

ان وعیدوں کے بعد صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین عظام نے قرآن کی تفسیر میں کیا کچھ احتیاط نہ کی ہوگی، تفسیر قرآن کا درجہ تو بہت بڑی چیز ہے، وہ مطلق روایتِ حدیث میں اتنے محتاط تھے کہ اس میں تغیر و تبدل کے خیال سے رسول اللہ صلعم سے سنی ہوئی حدیثوں کو بھی آپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ڈرتے تھے، حدیث بیان کرنے میں خوف و احتیاط کرتے تھے، بہت سے صحابہ اس سے پہلو بچاتے تھے، روایت کرتے وقت شدتِ خوف سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا، تو جب قولِ رسول میں وہ اتنے محتاط تھے تو قولِ خدا میں جس پر کفر و ایمان کا دار مدار تھا اور جس کے متعلق ایسی صریح وعید موجود تھی کیا کچھ احتیاط نہ کی ہوگی، محرم اسرار قرآنی ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے،

ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن برائی او بما لا اعلم (ابن جریر ج اول ص ۲۶) کون زمین میرا بار اٹھائے گی اور کون آسمان مجھے اپنے سایہ میں لے گا، اگر میں قرآن میں اپنی رائے سے یا بغیر علم کے کچھ کہوں،

حضرت علیؓ سے بھی اسی قسم کا قول مروی ہے، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ معمولی معمولی آیات کی تفسیر میں احتیاط کرتے تھے، ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ سے ایسی معمولی آیت کی تفسیر پوچھی گئی کہ اگر تم میں سے کسی سے پوچھی جاتی تو وہ بیان کر دیتا، لیکن انھوں نے اس کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کیا (ابن جریر ج ا ص ۲۸)

اکابر تابعین جن میں متعدد مفسر قرآن بزرگ تھے تفسیر بیان کرنے میں بڑے سخت محتاط تھے، عبید اللہ بن عمر کا بیان ہے کہ فقہائے مدینہ میں سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب

اور نافع، تفسیر بیان کرنا بڑی جسارت کا کام سمجھتے تھے (ابن جریر ج ا ص ۲۸)

ابو عبداللہ انصاری قرطبی لکھتے ہیں کہ اسلاف میں سعید بن مسیب اور عامر الشعبی وغیرہ تفسیر قرآن کو بڑی جرأت اور ذمہ داری کا کام تصور کرتے تھے اور اس میں علم و امتیاز کے باوجود محض احتیاط اور تورع کی بنا پر توقف کرتے تھے...... گذشتہ تمام ائمہ مفسرین بڑے محتاط تھے (الجامع لاحکام القرآن ج ا ص ۱۲۹)

اب اس کو واقعات سے ملاحظہ کیجئے،

تابعین میں حضرت سعید بن مسیب تفسیر کے ممتاز عالم تھے، لیکن اس میں اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان کے صاحبزادے یحییٰ کا بیان ہے کہ جب ان سے تفسیر کے متعلق کوئی سوال کیا جاتا تو جواب دیتے کہ قرآن کے بارہ میں کچھ نہ کہوں گا، (ابن جریر ج ا ص ۲۸)

حضرت عمرؓ کے پوتے سالم بن عبداللہ جو جلیل القدر امام اور مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک تھے، تفسیر قرآن میں بالکل خاموش رہتے تھے، (تہذیب الاسماء ج ا ص ۲۷)

امام شعبی فرماتے تھے کہ میں تین چیزوں کے بارہ میں تا عمر نہ بولوں گا، قرآن، روح اور رائے، (ابن جریر ص ۲۸)

صحابہ اور تابعین کی تفسیری احتیاط کے یہ چند واقعات بطور مثال لکھے گئے ہیں، ان سب کا استقصار مقصود نہیں ہے، اس احتیاط کا مقصد تفسیر قرآن کو انسانی رائے کی آمیزش سے بچانا اور دوسروں کو اس میں محتاط بنانا تھا، ورنہ خود ان بزرگوں کی تفسیری روایات موجود ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس احتیاط کے بعد ان روایات کا کیا پایہ ہوگا،

تفسیر بالرائے کے معنی

تفسیر بالرائے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآن کے سمجھنے میں مطلق عقل و فہم کو دخل نہ دیا جائے کہ یہ شے خود تعلیم قرآن کے خلاف ہے، قرآن تو خود اپنی آیات پر غور و فکر کرنے کی دعوت

دیتا ہے،

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۔ (ص - ۳)	ہم نے تمھاری طرف مبارک کتاب اتاری ہو تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور و فکر کریں اور عقل رکھنے والے نصیحت حاصل کریں،
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۔ (محمد - ۳)	کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگے ہیں،

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں ان کی موجودگی میں تدبر فی القرآن سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن "تدبر" اور تفسیر بالرائے میں فرق ہے، تدبر سے مراد حقیقت تک پہنچنے کے لئے دیانت کے ساتھ غور و فکر اور تفسیر بالرائے سے مراد اپنے گمان کے مطابق رائے دینا، یہاں رائے سے مراد وہ رائے نہیں ہے جو فہم قرآن کے تمام وسائل اختیار کرنے کے بعد پوری تحقیق اور دیانت داری سے قائم کی جائے کہ یہ توعین ثواب اور قرآن کا مقصود اصلی ہے بلکہ وہ رائے مراد ہے، جو تفسیر کے جملہ شرائط و لوازم کو نظر انداز کرکے محض اپنے کسی خیال، نظریہ اور مسلک کی تائید میں کسی نہ کسی طرح حاصل کی جائے، یعنی کسی مسئلہ کی واقعی تحقیق مقصود نہ ہو، بلکہ اپنے مسلک کے مطابق قرآن کے مفہوم کو ڈھالنے کی کوشش کی جائے، جس طرح بہت سے پرانے اسلامی فرقوں نے کیا ہے کہ متضاد مسلک رکھنے والے اپنے اپنے مسلک کی تائید قرآن ہی سے کرتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ دو متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک ہی کی تائید قرآن سے ہوسکتی ہے،

تفسیر بالرائے کے نتائج آجکل تفسیر بالرائے کے اتنے مظاہر ہیں کہ ان کی مثال دینے کی ضرورت نہیں، دور جدید کے محققین کے اجتہادات میں روزانہ اس کی مثالیں نظر آتی رہتی ہیں، کوئی صاحب "صلوٰۃ" کے معنی صرف دعا کے لیکر اس کی مخصوص و متعین شکل کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے، کوئی صاحب نماز کو تو قائم رکھتے ہیں، لیکن اس کے اوقات میں تخفیف فرماتے ہیں، کسی کے نزدیک "زکوٰۃ" کی مقدار متعین نہیں، کسی کے نزدیک "روزہ" کی موجودہ شکل قرآن سے ثابت نہیں، کوئی بزرگ "قربانی" کو غیر ضروری بتاتے ہیں، کسی کے نزدیک جنت اور فوز و فلاح کے معنی دنیاوی و مادی ترقیوں کے ہیں، اور دوزخ اور خسران اس سے محرومی کا نام ہے، اس قبیل کے ایک دو نہیں معلوم نہیں کتنے خرافات ہیں،

تفسیر قرآن کے اصول اور تفسیر بالرائے سے بچنے کے طریقے اور یہ سارے مفسرین علم و اجتہاد کے مدعی ہیں اور اپنے مزعومات پر اپنی فہم کے مطابق قرآن ہی سے دلیل لاتے ہیں، یہ سب نتیجہ ہے فہم اور تفسیرِ قرآن کے اصول و شرائط سے بے نیازی کا، اور اس غلطی کے نتائج انھی تک محدود نہیں، بلکہ متعدی ہو کر مذہب سے ناواقف مسلمانوں کو بھی مسموم کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ فہم اور تفسیرِ قرآن کا ایسا معیار مقرر کیا جائے جو نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ علمی اور عقلی حیثیت سے بھی عہد حاضر کے دانشمندوں کے لئے قابلِ قبول ہو اور جس کی پابندی سے اس قسم کی غلطیوں کے امکانات کم ہو جائیں، اور یہ وہی اصول و معیار ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بنایا اور وہ خود اور ان کے بعد تمام ائمہ اسلام اس کے پابند رہے،

اس سلسلہ میں ایک اصول یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنی چاہیے، کسی حد تک یہ اصول کام دے سکتا ہے کیونکہ کلام اللہ کے بعض الفاظ اور مصطلحات کی تشریح خود اسکی آیات سے ہو جاتی ہے، لیکن ہر جگہ یہ اصول نہیں چل سکتا، کسی ایک مسئلہ کو لے لیجئے، مثلاً روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق وغیرہ کے اشکال اور ان کے جزئی مسائل قرآن سے

نہیں معلوم ہو سکتے، ان کے لئے لامحالہ دوسری چیزوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، پھر قرآن کی قرآن سے تفسیر کے لئے بھی کچھ علم و نظر درکار ہے؟ ایک شخص جو قرآن ہی نہیں سمجھتا وہ اس کی تفسیر قرآن سے کیسے کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جو شخص سرے سے لغات کی صحت ہی کا منکر ہے اس کے لئے قرآن بھی اپنی آیات کا مفسر نہیں رہ سکتا،

بہرحال ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھ کر تفسیر قرآن کا ایسا نصاب ہونا چاہئے جس کی روشنی میں فاحش اغلاط کے امکانات کم ہو جائیں،

علماء اور مفسرین نے تو تفسیر قرآن کے بہت شرائط لکھے ہیں اور اس کے لئے بیسیوں علوم کی ضرورت بتائی ہے، لیکن ان میں ہمارے نزدیک بہت سے علوم غیر ضروری ہیں جو صنعتِ تفسیر میں تو کام آسکتے ہیں، لیکن نفس فہم قرآن کے لئے ان کی ضرورت نہیں، اسلئے ہم صرف ان علوم اور اصول و شرائط کو پیش کرینگے جو فہمِ قرآن کے لئے ناگزیر ہیں، نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ علمی اور عقلی حیثیت سے بھی،

۱- زبان یا لغت، دنیا کی ہر زبان پر عبور کے لئے سب سے مقدم اس زبان کے لغات کا علم ہے، خصوصاً غیر اہلِ زبان کسی اجنبی زبان کو بغیر اس کے لغات کے علم کے سمجھ ہی نہیں سکتا، اور اہل زبان کو بھی عبور حاصل نہیں ہو سکتا، پھر اس علم کے مدارج ہیں، کسی زبان کے لغات پر جس قدر نظر وسیع ہو گی اور اس کے مزاج کا جس قدر علم اور ذوق ہو گا، اسی قدر اس زبان کے اسرار سے واقفیت ہو گی اور اس پر عبور حاصل ہو گا،

قرآن بھی ایک انسانی زبان عربی میں ہے اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے بھی اس کے لغات کا علم ضروری ہے، قرآن عربی میں ہے،

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (زخرف-۱) — بیشک ہم نے اسکو عربی قرآن بنایا تاکہ تم لوگ سمجھو،

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (طٰہٰ-۶) — اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن اتارا،

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ، (زمر-۳) — قرآن عربی میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں تاکہ وہ لوگ تقویٰ اختیار کریں،

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ، (حمٓ سجدہ-۱) — یہ کتاب ہے جس کی آیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں قرآن عربی میں ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں،

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ، (شعراء-۱۱) — (قرآن) کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں ہے،

لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ، (نحل-۱۴) — جس زبان کا نام لیتے ہیں، وہ تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے یا جس شخص کی طرف نسبت

اور اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں، اس لئے قرآن کے لغات کا حل کلامِ عرب کے مطابق ہونا چاہئے، یا اگر شارع نے لغات سے ہٹ کر کسی لفظ کی کوئی اور تشریح کی ہے تو اس کے مطابق ہونا چاہئے، مثلاً "صلوٰۃ" کے معنی عربی زبان میں مطلق دعا کے ہیں، لیکن شارع نے اس کو دعا کی ایک خاص شکل کے ساتھ مخصوص کر دیا، یا "زکوٰۃ" کے معنی مطلق طہارت اور پاکی کے ہیں، لیکن اسلامی اصطلاح میں اس مال کو کہتے ہیں جو ایک مقررہ مقدار میں جمع شدہ مال کی پاکی کے لئے ایک مقررہ مقدار میں خدا کی راہ میں نکالا جائے یا "جہاد" کے معنی مطلق محنت اور کوشش کے ہیں، لیکن شارع نے اس کو اس محنت اور کوشش کے ساتھ خاص کر دیا ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کی جائے، خواہ وہ جانی ہو یا مالی یا جسمانی مشقت کے ذریعہ سے، اس قسم کی اور دوسری اصطلاحوں میں شارع کی تشریح کی پابندی ضروری ہے،

اس کے علاوہ ہر صورت میں کلامِ عرب کی سند ہونی چاہئے، قرآنی الفاظ کے کوئی ایسے معنی مراد نہیں لئے جا سکتے جن معنوں میں وہ کلامِ عرب میں مستعمل نہ ہو کہ ہر زبان کا اصول

یہی ہے، اگر کلام عرب کی قید توڑ دی جائے گی تو ہر شخص آزاد ہو جائیگا، اپنے اغراض کے مطابق جس لفظ کے جو معنی چاہے مراد لے، اور کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہیں کر سکتا کیا اور نہ صرف اپنی تحقیق کی صحت پر اصرار کر سکتا ہے کہ جب کوئی شرط اور قید باقی نہ رہ گئی تو ہر شخص اپنی فہم یا اپنے اغراض کے مطابق تاویل کرنے کا مجاز ہے، ایسی صورت میں کلام اللہ کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے،

اسی شے کو روکنے کے لئے عہد خلفاء اور عہد صحابہ میں لغات عرب کا علم ضروری قرار دیا گیا، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دے دیا تھا

ان لا یقرئ الناس الا عالم باللغة (کنز العمال) صرف عالم لغت لوگوں کو قرآن پڑھائے

آپ فہم قرآن کے لئے کلام عرب کا علم ضروری سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو اس کے حفظ کا حکم دیتے تھے

أیُّها الناسُ علیکم بدیوانکم لا تضلوا قالوا وما دیواننا قال شعر الجاهلیة فیه تفسیرُ کتابکم، (تفسیر کبیر)

لوگو! اپنے دیوان کی حفاظت کرو تاکہ گمراہ نہ ہو، لوگوں نے پوچھا ہمارے دیوان کیا ہیں، فرمایا جاہلیت کے شعر اس میں تمہاری کتاب (قرآن) کی تفسیر ہے

ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے تھے،

اذا خفی علیکم من القرآنِ فابتغوہ فی الشعر فانہ دیوان العرب (تفسیر کبیر)

جب قرآن کی کوئی چیز تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کو شعر میں تلاش کرو کہ وہ عرب کا دیوان ہے

ایمۂ اسلام کے اور بہت سے اقوال ہیں،

حضرت ابن عباسؓ قرآن کے الفاظ کی تشریح میں کلام عرب سے سند پیش کرتے تھے، سعید ابن جبیر اور یوسف بن مہران کا بیان ہے کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ ابن عباسؓ سے جب قرآن کی کوئی چیز پوچھی جاتی تھی تو پہلے اس کو بتاتے پھر کہتے تم نے سنا نہیں شاعر یہ کہتا ہے

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے "ثیابك فطھر" کے معنی پوچھے آپ نے فرمایا کہ "دھوکے کے کپڑے نہ پہنو" اور غیلان ثقفی کا یہ شعر پیش کیا،

فانی بحمد اللہ لا ثوب غادرٍ لبستُ ولا من سوءۃٍ اتقنّعُ

اسی طرح ایک مرتبہ کسی نے "فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ" کے معنی پوچھے فرمایا "زمین" اور سند میں امیہ بن ابی الصلت کا یہ شعر پیش کیا،

وفیها لحم ساهرةٍ وبحرٍ وما فاھوا بہ لھمُ مقیم

ایک مرتبہ کسی نے "لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" میں "سنة" کے معنی پوچھے فرمایا "اونگھ" اور سند میں زہیر بن ابی سلمی کا یہ شعر پیش کیا،

لا سِنَةٌ فی طوالِ اللیلِ تاخذہٗ ولا ینامُ ولا فی امرہ فندُ

(الجامع لاحکام القرآن ج ا ص ۲۱ و ۲۲)

تابعین اور تبع تابعین کا بھی یہی طریقہ تھا، مشہور مفسر تابعی مجاہد بن جبیر جو ابن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے، فرماتے تھے،

لا یحلُّ لاحدٍ یومن باللہ والیوم الآخرة ان یتکلم فی کتاب اللہ اذا لم یکن عالمًا بلغات العرب (اتقان سیوطی)

جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ لغات عرب کے علم کے بغیر کتاب اللہ کے بارہ میں گفتگو کرے،

امام مالک فرماتے تھے،

لا اُوتی برجل غیر عالمٍ بلغات العرب تفسیر کتاب اللہ الا جعلتہ [illegible]

جو غیر عالم لغت کتاب اللہ کی تفسیر کرتا ہے اسکو خدا اس کے لئے وبال بنا دیتا ہے،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نامور غلام اور جلیل القدر تابعی عکرمہ بھی جنھیں حضرت ابن عباسؓ نے بڑے اہتمام سے تفسیر کی تعلیم دی تھی اپنے آقا اور استاد کے طریقہ پر قرآن کے معنی میں کلام عرب سے استشہاد کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے "ذَوَاتَا اَفْنَان" کے معنی پوچھے، انھوں نے "سایہ اور شاخ والے" بتایا اور سند میں یہ اشعار پیش کئے!

ماھاج شوقك من ھدیل حمامۃ تدعو علی فنن الغصون حماما

تدعو یا فرخین صادف طائرا ذا مخلبین من الصقور قطاما

اس طریقہ سے "زنیم" کے معنی کی سند میں جس کے معنی "ولد الزنا" اور "فاحش و لئیم" کے ہیں، یہ اشعار پیش کئے،

زنیم لیس یعرف من ابوہ بغی الام ذو حسب لئیم

زنیم تداعاہ الرجال زیادۃ کما زید فی عرض الادیم اکارع

تفسیر کی بڑی بڑی کتابوں میں لغات قرآن کے معنی کی تشریح میں کلام عرب سے بکثرت شواہد ہیں،

ابو عبداللہ انصاری قرطبی لکھتے ہیں کہ اصحاب رسول اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کے غریب اور مشکل لغات میں کلام عرب سے احتجاج کرتے تھے، (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۰)

(۲) نحو لغت کے بعد لیکن اہمیت میں اسی کے برابر کسی زبان کے سمجھنے کے لئے اس زبان کے قواعد ہیں، جسے عربی میں صرف و نحو کہتے ہیں، کسی زبان کو بغیر اس کے قواعد کے علم کے نہیں سمجھا سکتا، اور عربی زبان کو اس باب میں اور بھی خصوصیت حاصل ہے، اس کی صحت کا دار و مدار تمامتر اس کی ترکیبوں کے سمجھنے اور ان کے اعراب کی صحت پر ہے، بغیر اس کے

نہ عبارت صحیح پڑھی جا سکتی ہے اور نہ معنی سمجھے جا سکتے ہیں، اور ترکیب و اعراب کی صحت بغیر صرف و نحو پر عبور کے نہیں ہو سکتی، اعراب کے ذرا تغیر و تبدل سے معنی بدل جاتے ہیں، اس لئے قرآن کے اعراب کی صحت کی سخت تاکید ہے، اس تاکید کی حدیثیں بھی مفسرین نے نقل کی ہیں اور صحابہ اور تابعین کے اقوال تو بکثرت ہیں، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ فرماتے تھے،

اعراب القرآن احب الینا عن حفظ حروفہ، — قرآن کے اعراب کی صحت ہمارے لئے اس کے حروف کے یاد کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے،

حضرت عمرؓ اعراب کی تصحیح کی ترغیب کے لئے فرماتے تھے،

من قراء القرآن فاعربہ کان لہ عند اللہ اجر شہید، — جس نے اعراب کی صحت کے ساتھ قرآن کی قرات کی اسکو خدا کے یہاں شہید کا اجر ملے گا،

حضرت عبداللہ بن عمر، مکحول، حسن بصری، شعبہ اور حماد بن سلمہ رضی اللہ عنہم سے بھی اس قسم کے اقوال منقول ہین، (دیکھو الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۰)

ابن عطیہ کا قول ہے کہ اعراب اصل شریعت ہے کہ اسی پر اس کے معنی کی درستی کا مدار ہے اور معنی کی درستی ہی شریعت ہے (ایضاً)

اسی لئے حضرت عمرؓ نے عام حکم دیدیا تھا،

تعلموا اعراب القرآن کما تعلمون حفظہ، (کنز العمال) — جس طریقہ سے قرآن کے حفظ کی تعلیم حاصل کرتے ہو اسی طریقہ سے اسکے اعراب کی تعلیم حاصل کرو،

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب کی تصحیح کے لئے سب سے پہلے آپ ہی نے ابو الاسود دوئلی کو نحو کی تدوین کا حکم دیا تھا،

فامر ابا الاسود فوضع النحو (کنز العمال و بیہقی) — ابو الاسود کو حکم دیا انھوں نے نحو کے قواعد وضع کئے،

لیکن صحیح یہ ہے کہ ابو الاسود نے حضرت عمرؓ کے حکم سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے حکم سے اور آپ سے سیکھ کر نحو کے قواعد وضع کئے تھے (تفصیل کے لئے دیکھو فہرست ابن ندیم)

بہر حال حکم سے بحث نہیں جس نے بھی دیا ہو، مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کے اعراب کی تصحیح کے لئے عہد صحابہ ہی میں نحو وضع کی گئی تھی،

۳- **تیسری چیز معنی بیان اور بدیع ہے**، ان تینوں میں فرق ہے، لیکن سب کا تعلق کلام کے محاسن اور خوبیوں سے ہے اس لئے آسانی کے خیال سے ہم تینوں کو ایک ساتھ لکھ دیا، ہر ترقی یافتہ زبان میں دو طرح کے قواعد ہوتے ہیں، ایک عبارت، ترکیب اور کلام کے دروبست کی صحت کے لئے، دوسرے اس عبارت میں لفظی و معنوی محاسن اور صنعتیں پیدا کرنے کے لئے یا ان کے جانچنے کے لئے، اس کا تعلق کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہے، اسے عربی میں معنی بیان اور بدیع کہتے ہیں، ممکن ہے بعض زبانوں میں سب کام ایک ہی قواعد سے لئے جاتے ہوں، فصاحت و بلاغت یا معنی بیان اور بدیع کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مطلب کو ایک معمولی پڑھا لکھا بھی سادہ اور معمولی طریقہ سے ادا کر دیتا ہے، لیکن ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اس میں اپنی بلاغت، قدرتِ تحریر اور حسن مذاق سے وہ سحر بھر دیتا ہے کہ سننے والا اس کے لفظی اور معنوی محاسن پر سر دھننے لگتا ہے، یہی چیز بلیغ کلام کی جان ہے،

کلام اللہ اس بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اس کی بلاغت اس کا معجزہ ہے، اس نے فصحائے عرب کو اپنا مثل بنانے کی تحدی کی، لیکن وہ اپنی اسلام دشمنی اور ساحرانہ قوت کلام کے باوجود ایک آیت بھی اس کے جواب میں نہ پیش کر سکے، اور کوشش کے باوجود عاجز و درماندہ رہے، ایسے معجزانہ کلام کی لفظی و معنوی نزاکتوں کے سمجھنے کے لئے معنی بیان اور بدیع ضروری ہے،

کلام اللہ میں معنی بیان اور بدیع کے اعلیٰ ترین نمونے موجود ہیں اور وہ فصل وصل، اطناب، تشبیہ، تمثیل، استعارہ، کنایہ، حقیقت، مجاز، حذف، تقدیم، تاخیر، استفہام کے جملہ اقسام اور نفی اثبات، اختصاص وغیرہ معنی بیان اور بدیع کے تمام اصناف سے معمور ہے اور پھر اس کا اثر الفاظ ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ معنی پر بھی پڑتا ہے جس پر اوامر و نواہی کا دار و مدار ہے، بہت سے مواقع پر الفاظ و معنی کی نزاکتوں اور نکتوں کو سمجھے ہوئے بغیر کلام اللہ کا مقصود سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، خصوصاً محذوفات قرآنی پر جس کی نظر نہ ہو اس کیلئے قدم قدم پر لغزش کا امکان ہے، اس لئے بغیر معنی بیان اور بدیع کے علم کے ہم مقصود قرآنی سے واقف نہیں ہو سکتے،

مفسرین اور علمائے بدیع نے کلام اللہ کے اس پہلو پر تفصیلی بحثیں کی ہیں اور کلام اللہ سے بکثرت اس کی مثالیں پیش کی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے الفوز الکبیر میں بھی بعض پہلوؤں پر نہایت مفید بحثیں کی ہیں، لیکن ہمارا مقصود صرف اس پہلو کی جانب اشارہ کرنا ہے اس لئے اس کی تفصیلات قلم انداز کرتے ہیں، ابن جریر نے فہم قرآن کے لئے صرف نحو اور معنی بیان کے علم کی ضرورت پر کلام اللہ سے نہایت لطیف استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"خدا نے اپنے بندوں کو مختلف آیتوں میں قرآن کے امثال، مواعظ اور حکم پر غور و فکر کرنے اور ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ — ہم نے تمہاری طرف مبارک کتاب اتاری
لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ — تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور
أُولُو الْأَلْبَابِ، — عقل والے نصیحت حاصل کریں،

لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ — ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی
مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ، (روم) — مثالیں دی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں،

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی تاویل کا اس طرح جاننا ضروری ہے کہ کسی آیت کے معنی اور اس کا مفہوم مخفی نہ رہے، اس لئے کہ خدا نے قرآن کے مواعظ و حکم اور امثال پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے اور جو شخص پہلے سے ایک چیز کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اور اس کی تاویلات کو نہیں جانتا، اس کو اس چیز پر غور و فکر کرنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایسی چیز پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جس کو وہ نہیں جانتا اور نہیں سمجھتا اور اس قسم کا حکم عقلاً محال ہے، یہ حکم اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب پہلے سے مخاطب اس کو سمجھتا ہو، اس کے بعد وہ اس کے مواعظ و حکم اور امثال پر غور و فکر کر سکے گا، کسی شے کے معنی سمجھنے سے پہلے اس غور و فکر کا حکم دینا ایک بے معنی سی بات ہے یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ کسی ایسی قوم کو جو عربی زبان (کلام) سے ناواقف ہے یہ کہا جائے کہ وہ کسی عرب شاعر کے پُر موعظت و حکمت قصیدہ پڑھ کر اس کے امثال پر غور و فکر اور اس کے مواعظ کو دلنشین کریں، کسی کلام کے معنی سمجھنے سے پہلے اس کے امثال پر غور و فکر کا حکم دینا محال عقلی ہے ایسا حکم جانور اور انسان دونوں کو دینا برابر ہے اس قسم کا حکم تو منطق اور معنی بیان سے واقفیت کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے، یہی حال قرآن مجید کی آیات سے عبرت آموزی اور اس کے امثال و مواعظ پر غور و فکر کرنے کے حکم کا ہے، (ابن جریر ج اول)

۴- چوتھی شے اور سب سے اہم احادیث نبوی اور تاریخ قرآن کا علم ہے، اس کی اہمیت ضرورت اور درجۂ استناد پر اوپر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے، اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف ان کے بعض پہلو پیش کئے جاتے ہیں،

حدیث کی اہمیت اس قدر عیاں ہے کہ اس پر کسی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں،

اسلام کی کسی جہت کو ہم بغیر حدیث کی مدد کے اچھی طرح سمجھ ہی نہیں سکتے، حتی کہ اسلام کے ارکان صوم و صلوٰۃ اور زکوٰۃ و حج کی شکل اور اس کے مسائل سے بھی واقف نہیں ہو سکتے جو لوگ حدیث کے منکر ہیں یا اسے لائق استناد نہیں سمجھتے ان کیلئے بھی بغیر اس کی مدد کے چارہ نہیں ہے، اگر ان سے پوچھا جائے کہ نماز کی موجودہ شکل، اس کے مسائل زکوٰۃ کی مقدار اور اس کے اجناس کی تعیین، حج کے مناسک کی تفصیل قرآن میں کہاں ہے تو ان کو بھی حدیث ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی، زیادہ سے زیادہ یہ لایعنی جواب دینگے کہ "امت کے عملی تواتر" سے ثابت ہے، لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ اگر وہ عملی تواتر ہے" تو یہ "علمی تواتر" اور عمل علم ہی سے ماخوذ ہے، رسول اللہ صلعم پہلے زبان سے تعلیم دیتے تھے پھر اس پر عمل کر کے دکھاتے تھے، وہی صحابہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمۂ اسلام جو ایک کام کو نسلاً بعد نسل کرتے چلے آئے، وہی اس کی علمی تعلیم کو اسی تواتر کے ساتھ زبان سے کہتے چلے آئے، دونوں میں فرق کیا ہوا کہ ایک قابل اعتبار ٹھہرا اور دوسرا ناقابل استناد، جبکہ عمل اور قول میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ جو کچھ زبان سے کہا اسی کے مطابق عمل کیا،

پھر جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اسلام کی ابتدائی تاریخ کہاں سے مرتب ہوئی؟ قرآن میں تو عہد رسالت کے واقعات کے اشارات ہیں یا کہیں کہیں اجمالی بیان ہے، پھر یہ امت کی ابتدائی تاریخ کہاں سے وجود میں آئی، احادیث اور صرف حدیث سے اور اس پر اتنا ہی یقین ہے، جتنا فرائض اور واجبات پر، اس کے معنی یہ ہوئے کہ بخاری مسلم اور دوسری حدیث کی کتابوں کے وہ ابواب جن کا تعلق سیرت نبوی سے ہے وہ تو معتبر اور جن کا تعلق اسلامی مسائل سے ہے غیر معتبر، آخر کس اصول پر جبکہ دونوں کا معیار صدق ایک ہی ہے اور دونوں کی روایتیں ایک ہی شرائط کے مطابق ہیں،

اس موقع پر سیرت کی کتابوں کو پیش نہ کیا جائے کہ وہ بیشتر احادیث ہی کی روایات سے مرتب کی گئی ہیں یا حدیث ہی کی طرح معنعن روایات سے، لیکن ان میں احادیث کی روایات کے جیسا صحت کا اہتمام نہیں ہے اسلئے انکا درجہ کتب حدیث سے کہیں پست ہے اس لئے وہ اور بھی زیادہ ناقابل اعتماد ہوں گی، اس لئے یا تو حدیثوں کی صحت و استناد کا اقرار کیا جائے یا نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو غیر تاریخی شخص تسلیم کیا جائے جس کے صحیح اور مستند حالات کا ہم کو علم نہیں، لیکن منکرین حدیث بھی ایسا نہیں کرسکتے اس لئے حدیث کے بغیر ان کے لئے بھی چارۂ کار نہیں ہے گو وہ بعض مسائل میں اپنی من مانی تاویل کے لئے اس کو غیر معتبر سمجھیں،

۵۔ اصول فقہ: پانچویں چیز اصول فقہ کا علم ہے، قرآن ایک قانونی کتاب ہے بلکہ پہلے وہ اسلامی قانون ہے اس کے بعد اور کچھ ہے، دنیا کے ہر ترقی یافتہ قانون کے کچھ اصول بھی ہوتے ہیں جن پر اس قانون کی بنیاد ہوتی ہے، اور جن کے علم کے بغیر نہ اس قانون کی حیثیت منقح ہوتی ہے اور نہ اس کا حقیقی منشا سمجھا جاسکتا ہے، اور نہ اس میں مہارت ہوسکتی ہے، اس اصول سے قرآن قانون ہے اور اصول فقہ اصول قانون، ظاہر ہے کہ عام انسانی کلام کی طرح قرآن کے الفاظ عام بھی ہیں خاص بھی، مطلق بھی ہیں مقید بھی، مفرد بھی ہیں مشترک بھی، مؤول بھی ہیں حقیقت بھی ہیں مجاز بھی، صریح بھی ہیں کنایہ بھی، خفی بھی ہیں مشکل بھی، متشابہ بھی ہیں غریب بھی، امر بھی ہیں نہی بھی اور پھر ان سب کی مختلف قسمیں ہیں پھر ان کے ترکیبی ردو بدل اور صلات کے تغیر سے ان کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اگر اصولی حیثیت سے ان الفاظ سے احکام کے استنباط اور ان کے مدارج کی تعیین کا کوئی اصول وقانون نہ ہوگا تو قرآن سے حلال وحرام، فرض وواجب، مستحب اور مباح وغیرہ اوامر ونواہی کا استنباط ہی نہیں ہوسکتا، اس لئے اصول فقہ کا علم فہم قرآن کا ایک اہم رکن ہے اور اسی پر اوامر ونواہی کا دارومدار ہے

۶۔ نزول قرآن کی تاریخ کا علم، اس میں عرب جاہلی کے حالات، عہد رسالت کے واقعات، یہود ونصاریٰ اور ملت ابراہیمی کے پیرووں کی اجمالی تاریخ سب شامل ہے، اس لئے کہ قرآن کے اوامر ونواہی اور تاریخی واقعات کا تعلق انہی سے ہے، قرآن نے عرب جاہلی کے عقائد ورسوم کی اصلاح کی، ان کے سامنے ایک نیا قانون اور ایک نئی شریعت پیش کی، منافقین، مشرکین اور یہود ونصاریٰ کی گمراہیوں کی پردہ دری کی، ان کے ساتھ اختلافات اور لڑائیاں پیش آئیں، جب تک ان سب واقعات کا علم نہ ہوگا کہ نزول قرآن کے وقت ملت ابراہیمی کے پیرووں اور یہود ونصاریٰ کی مذہبی اور اخلاقی حالت کیا تھی، قرآن عرب کے کن حالات میں نازل ہوا، اس نے گذشتہ عقائد ورسوم میں کیا اصلاحیں کیں، اس کے کیا نتائج مترتب ہوئے، دعوت اسلام کے سلسلہ میں کیا کیا واقعات پیش آئے، اس وقت تک قرآنی تعلیمات اور اس کے احکام کے اسباب ومصالح اور اس کی غرض وغایت اور اس کے تاریخی اشارات سمجھ میں نہیں آسکتے،

قرآن میں بہت سے قدیم انبیاء ورسل اور قدیم اقوام اور ان کے آثار کا ذکر ہے، ان کا اجمالی علم بھی تفسیر کے لئے مفید ہے، بعض مفسرین نے علم کلام کو خاص اہمیت دی ہے، لیکن ہمارے نزدیک نفس فہم قرآن کے لئے یہ بالکل غیر ضروری ہے، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم نے بغیر عقلی موشگافیوں کے قرآن کو سمجھا اور ہم سے بہتر سمجھا، اس لئے ہمیں بھی اس میں پڑنے کی ضرورت نہیں، جن علماء نے اس حیثیت سے قرآن پر نظر ڈالی ہے، ان کے حسن نیت میں شبہہ نہیں، خدا ان کو ان کی نیت کا صلہ دے، انھوں نے اپنے زمانہ کے ذوق کے مطابق بعض پہلوؤں سے قرآن کی خدمت بھی کی، لیکن اس سے فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچا، اشاعرہ، معتزلہ اور دوسرے متکلم فرقوں کی موشگافیوں بلکہ ذہنی خیال آرائیوں

نے اسلام کے صاف اور سادہ عقائد میں سیکڑوں گتھیاں پیدا کر دیں، جن لوگوں کو اس قسم کے مباحث کا ذوق ہو ان کے لئے یہ ذہنی تفریح کا سامان تو ہے لیکن اس سے نہ نفس فہم قرآن میں مدد ملتی ہے اور نہ وہ اس زمانہ کے لئے مفید ہے، البتہ جدید رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے کلام اللہ کی تفسیر میں نئے علم کلام کا لحاظ رکھنا مفید بلکہ ایک حد تک ضروری ہے،

قرآن کے ساتھ علمائے اسلام کا اعتنا، اور دوسرے علوم قرآنی

ان علوم کے علاوہ مفسرین نے اور بہت سے علوم گنائے ہیں، اور علمائے اسلام نے سیکڑوں پہلوؤں سے قرآن پر نظر ڈالی ہے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ باقی نہ رہ جائے، اس ذوق اور تحقیق نے بیشمار علوم پیدا کر دیئے، ان میں سے چند کے سوا جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور باقی فہم قرآن کے لئے ضروری نہیں ہیں، البتہ مہارت فن کے لئے کار آمد ہو سکتے ہیں، اگرچہ یہ علوم غیر ضروری ہیں لیکن ہم اس لئے ان کا ذکر کئے دیتے ہیں کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ہمارے اسلاف نے قرآن کے ساتھ کتنا اعتنا کیا اور اس پر اتنا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑ گئے کہ مذاہب عالم کی تاریخ میں اسکی مثال نہیں مل سکتی،

امام شافعیؒ نے ان علوم کی تعداد ترسٹھ (۶۳) بتائی ہے، بعض علما، اسی بتاتے ہیں جن میں کتابیں تالیف ہو چکی ہیں، بعض کے نزدیک یہ تعداد مبالغہ آمیز حد تک پہنچ جاتی ہے (مفتاح السعادۃ)

بہر حال مبالغہ کو حذف کرنے کے بعد بھی ان کی تعداد کافی رہ جاتی ہے، ابن ندیم نے فہرست میں جو علوم گنائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں قرآنی تحقیق پر کتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا، ان کے شمار کردہ علوم کی فہرست حسب ذیل ہے،

قرأت، تفسیر، قرآن کے معنی اور اس کے مشکل و مجاز، غریب القرآن، لغات القرآن، نقط اور شکل، لامات قرآن، قرآن کے اوقاف و ابتدا، اختلاف مصاحف، وقف تمام، قرآن کے متحد اللفظ اور مختلف المعنی الفاظ، متشابہات قرآن، ہجا، قرآن کے مقطوع و موصول اجزا،

فضائل قرآن، عدد آیات، ناسخ و منسوخ، نزول القرآن، احکام،

ابن ندیم کے بعد ان علوم میں برابر اضافہ ہوتا رہا چنانچہ کشف الظنون اور مفتاح السعادۃ وغیرہ میں یہ فہرست اور زیادہ طویل ہے، گو ان میں قرآن سے متعلق ضمنی اور جزوی بحثوں کو بھی مستقل فن شمار کر لیا گیا ہے، اس لئے یہ فہرست اور زیادہ طویل ہو گئی ہے بہر حال وہ فہرست یہ ہے،

صرف، نحو، نقطے، معنی و بیان، بدیع کے جملہ اقسام، قرأت مع جملہ فروع، مشہور قرار، تفسیر، مفسر صحابہ، تفسیر کے مختلف جہات اور پہلو، تفسیر کے شرائط، اس کے منہیات، کلام، اصول فقہ، علل القرأت، آداب کتابت مصحف، تفسیر کے فروع، آیات کی تعیین، مکی، مدنی، حضری، سفری، نہاری، لیلی، صیفی، شتائی، فراشی، نومی، ارضی، سماوی، شان نزول، مکرر نزول کی آیات، وہ آیات جن کا حکم ان کے نزول سے موخر ہے، وہ آیات جن کا نزول ان کے حکم سے مؤخر ہے، وہ احکام جو آنحضرت صلعم کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ احکام جو دوسرے انبیاء اور رسل پر بھی نازل ہوئے، نزول قرآن کی کیفیت، قرآن اور اس کی سورتوں کے نام، ان کی جمع و ترتیب، اسکی سورتوں، آیات، کلمات اور حروف کی تعداد، آداب تلاوت قرآن، غریب القرآن، قرآن کے وہ الفاظ جو لغتہ حجاز کے خلاف ہیں، دوسری زبانوں کے الفاظ، وجوہ و نظائر، اعراب، ناسخ و منسوخ، مشکلات قرآن جن میں بظاہر اختلاف و تناقض کا گمان ہوتا ہے، سورتوں اور آیات کے فواتح و خواتم سورتوں اور آیات میں مناسبت معنوی، آیات متشابہات، امثال قرآن، اقسام قرآن، قرآن کے تاریخی واقعات، انبیاء اور رسل کے حالات وغیرہ،

ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر علوم کمال فن کے لئے کار آمد ہوں تو ہوں ورنہ نفس فہم قرآن اور اس کی تفسیر کے لئے صرف چند علوم کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ کلام اللہ ایک بحر ناپید اکنار ہے، جس کے عجائبات و اسرار کی کوئی انتہا نہیں، اور علوم ضروری بمنزلہ آلات عبور کے ہیں،

اور مفسر کشتیبان اس لئے سلامتی اسی میں ہے کہ ضروری آلات کی مدد سے اس کو عبور کیا جائے
کہ اس کی قلت اور کثرت دونوں میں ہلاکت ہے،

ایک قابل لحاظ نکتہ

قرآن کی تفسیر و تاویل میں ایک خاص نکتہ قابل لحاظ ہے بلکہ یہی تفسیر کے دائرہ کا مرکز ہونا چاہئے، اس کو پیش نظر رکھنے سے ہم بڑی حد تک قرآن کی غلط تفسیر و تاویل سے بچ سکتے ہیں دنیا کے ہر قانون، ہر مذہب، ہر تعلیم اور ہر نظام کی طرح اسلام کا ایک خاص نظام ہے، اس کے اجزا میں خاص ترتیب و تناسب اور اس کی تعلیمات میں ایک خاص روح ہے، جو اس کے تمام اجزا میں ساری ہے، اسے دلائل سے سمجھانا مشکل اور تفصیل طلب ہے، اس لئے کہ یہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، جسے اسلامی تعلیمات کا رمز شناس آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، اسے موٹی سی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہر صاحب طرز شاعر کے کلام میں خیالات اور طرز ادا کے اعتبار سے ایک خاص رنگ ہوتا ہے اور ہر صاحب تعلیم معلم اور مصنف کے خیالات میں ایک روح ہوتی ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، اگر ان کے کلام اور تصنیف سے ذوق اور دلچسپی رکھنے والے شخص کے سامنے کسی دوسرے شاعر یا مصنف کا کلام یا اس کے خیالات غلط منسوب کرکے پیش کیجئے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ اس شخص کا کلام اور اس کے خیالات نہیں ہو سکتے، اسی طرح اسلامی تعلیمات کا ذوق شناس اس سے الگ چیز کو فوراً پہچان لے گا، اس کے پرکھنے کا معیار صرف ذوق و بصیرت ہے، اگر قرآن کی تفسیر و تاویل میں اس روح کا لحاظ رکھا جائے تو غلطی کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے، اسی طریقہ سے اس کے سارے نظام میں ایک خاص ترتیب و تناسب ہے اور اس کے اجزا باہم اتنے مربوط اور پیوستہ ہیں کہ کسی جز کو علحدہ کرنے سے اسکا اثر سارے نظام پر پڑیگا، اس لئے قرآن اور اسلامی تعلیمات کی تفسیر میں اس کی روح اور پورے نظام کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

(باقی)

مولنا کاتبی نیشاپوری

از مولینا عبد السلام ندوی

(۲)

شاعری

مولنا کاتبی شاعری مین ایک خاص رنگ کے موجد یا کم از کم اوسکے نمایان کرنے والے ہین، اور اہل فن نے ان کی اس جدت طرازی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، چنانچہ مولنا جامی بہارستان مین لکھتے ہین،

"وے را معانی خاص بسیار است و در اداے آن معنی نیز اسلوب خاص دارد"[۱]

مولنا کاتبی کو خود اپنی اس جدت طرازی پر ناز ہے، اور جا بجا فخریہ اس کا اظہار کرتے ہین،

کاتبی خوش نیست جز با معنی رنگین خاص — زانکہ بلبل دوست میدارد گل ناخندیدہ را

شاعر بنا شد آنکو ہنگام بیت گفتن — زاشعار اوستادان آرد خیال در ہم،

ہر خانہ کہ او را از خشت کہنہ سازند — مانند خانہ نو نبود بنا ش محکم

لیکن اس جدت طرازی کے ساتھ ان مین ایک عیب بھی ہے، اور مولینا جامی نے نہایت واضح الفاظ مین اس کی پردہ دری کی ہے، چنانچہ مسٹر براون اپنی ہسٹری مین لکھتے ہین کہ "جامی بہارستان مین کہتے ہین کہ وہ اچھوتے خیالات کو اچھوتے انداز مین فرو ادا

[۱] بحوالہ تذکرہ مخزن الغرائب ذکر مولینا کاتبی نیشاپوری،

کرتے ہین لیکن ان کے اشعار مین توازن اور ہم آہنگی قائم نہین رہتی، بلکہ شتر گربگی پائی جاتی ہے"

مولنا کاتبی کے کلام کی نسبت یہی راے ان کے معاصرین کی بھی ہے چنانچہ مولنا کاتبی نے ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کے ہر مصرع میں شتر اور حجرہ کا لفظ التزاماً لائے تھے، اور یہ قصیدہ اس زمانہ مین نہایت مقبول ہوا تھا، چنانچہ تذکرہ مخزن الغرائب مین ہی،

"شتر حجرہ او بین الفضلا مشہور است کہ در ہر مصرع شتر و حجرہ لازم گرفتہ"

لیکن ایک بار چند شعراء و فضلاء نے اس قصیدہ کی تعریف کی تو امیرامین نزلابادی نے جو شاعری مین مولنا کاتبی کے حریف اور مدمقابل تھے، فی البدیہہ ایک قطعہ مین اس پر یہی نکتہ چینی کی،

اگر کاتبی در سخن گہ گہے　　　بلغزد بر دوق نگیرد کسے،

شتر حجرہ را گر نکو گفتہ لیک　　　شتر گربہا نیز دارد بسے،[لہ]

لیکن مولنا کاتبی کے کلام پر یہ اجمالی تنقید کافی نہین ہے، اسلئے ہم ان کے کلام پر تاریخی اور ادبی دونون حیثیتون سے ایک مفصل تبصرہ کرنا چاہتے ہین،

فارسی شاعری کا ایک خاص تاریخی دور

فارسی شاعری کی سب سے زیادہ مفصل تاریخ مولنا شبلی علیہ الرحمۃ کی کتاب شعر العجم ہے، لیکن اس کتاب مین مولنا نے فارسی شاعری کے ایک خاص دور کو بالکل نظرانداز کر دیا، ہی یعنی قدما کے بعد اونھون نے اس کتاب کے دوسرے حصے مین صرف ساتوین صدی تک کے شعراء کے حالات لکھے ہین، جن مین کمال اسماعیل، سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ وغیرہ زیادہ ممتاز ہین، اس کے بعد اونھون نے آٹھوین اور نوین صدی کے شعراء کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے، اور اس کتاب کے تیسرے حصہ مین صرف ان شعراء کو لیا ہے

لہ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۵۴ تذکرہ امین الدین نزلابادی،

جو ان دونون صدیون کے بعد ۹۰۰ھ میں یا اس کے بعد پیدا ہوئے، یہ متاخرین شعراے ایران کا دور ہے جس کی بنیاد فغانی نے ڈالی جس کا انتقال ۹۲۵ھ مین ہوا، اوس کے بعد نظیری اور عرفی وغیرہ نے فغانی کی تمام خصوصیات کو اور بھی زیادہ نمایان کیا چنانچہ والہ داغستانی فغانی کے متعلق لکھتے ہین :-

"بابا ے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش از وے احدے بآن روش شعر نہ گفتہ و پایۂ سخنوری را بجائے رسانید، کہ عنقاے اندیشہ پیرامون اونمی تواند پرید، اکثر استادان زمان مولینا وحشی یزدی و مولینا نظیری نیشاپوری و مولینا ضمیری اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولنا عرفی شیرازی، و حکیم شفائی اصفہانی و حکیم مسیحا رکناے کاشی، و مولنا محتشم وغیرہم تتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن و طرز روش اوبند"[لہ]

لیکن فغانی سے پہلے اور سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ کے بعد آٹھوین صدی مین سلطان بایسنغر (جو ۸۰۲ھ میں پیدا ہوا اور ۸۳۷ھ میں وفات پائی) کے زمانہ مین فارسی شاعری کا ایک خاص دور قائم ہوا، جو لکھنو کے دور آخر کی اردو شاعری سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا تھا، کیونکہ اس دور کے شعراء نے زیادہ تر اپنی شاعری کا دارومدار لفظی صنائع و بدائع پر رکھا تھا، چنانچہ مسٹر براؤن نے اپنی ہسٹری میں اس دور کی دو شاعرانہ خصوصیتین بتائی ہین،

۱- لفظی صنائع و بدائع کی پابندی،

۲- اشعار مین معما اور چیستان کا لکھنا،

اور دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ سے بھی قدم قدم پر اسکی تائید ہوتی ہے، مثلاً وہ مولنا شرف الدین رامی (جو آٹھوین صدی کے شاعر تھے) کے حال میں لکھتا ہے، :-

لہ ریاض الشعراء بحوالہ شعر العجم حصہ سوم صفحہ ۲۸

"ونسخہ در علم شعر ساختہ حدائق الحقائق نام وچند صنعت دران کتاب درج کردہ کہ رشید الدین وطواط در حدائق السحر آن صنائع را ذکر نکردہ بود، ازان جملہ میگوید، کہ رشید آوردہ کہ ایہام کلمہ را گویند کہ بر دو معنی شامل باشد و نیز ویک من میباید، کہ بچند معانی مشتمل باشد و این بیت خواجہ عماد فقیہ را باستشہاد می آرد"

دل عکس رخ خوب تو در آب روان دید

والہ شد و فریاد برآورد کہ ماہی

و شیخ عارف آذری علیہ الرحمۃ در کتاب جواہر الاسرار قصیدہ از قصائد مولنا شرف الدین رامی را ایراد می کند کہ تمامی صنائع و بدائع شعر دران قصیدہ مندرج است[1] و رباعی گفتہ کہ اسم ممدوح او خواجہ فخر الدین محمد الماستری از حروف آن بیرون می آید و آن اینست

خوارست جہان پیش نوالت یکسر،

فخرست ز القاب تو دین را و خطر،

تو کان محامدی و از فر گہر،

ز الماس ضمیرت سپر ی شد خنجر،[2]

اسی دور کے ایک اور مشہور شاعر مولنا لطف اللہ نیشاپوری ہین، اور دولت شاہ ان کے تذکرے مین لکھتا ہے،

صنائع شعر را از استادان کم کسے چون او رعایت نمودہ،[3]

شیخ آذری علیہ الرحمۃ در جواہر الاسرار میگوید کہ باعتقاد من این رباعی کہ مولنا لطف اللہ در مراعات نظیر گفتہ ممتنع الجواب است شد در قائلہ،

[1] دولت شاہ صفحہ ۲۰۰ [2] ،، صفحہ ۳۰۲ [3] ،، صفحہ ۳۱۸،

رباعی

گل داد پر یرہ در ع فیروزہ باد

دی جوشن لعل لالہ برخاک افتاد

داد آب چمن خنجر مینا امروز،

یاقوت سنان آتش نیلوفر داد

چہار روز و چہار سلاح، چہار رنگ و چہار جوہر و چہار عنصر و چہار گل رعایت نمودہ"[1]

اسی دور کے ایک اور شاعر خواجہ محمود برسہ ہیں، جن کے تذکرہ مین دولت شاہ لکھتا ہے،

"دو نامہ بنام علاء الدولہ میرزا گفتہ است در صنعت تجنیس و رعایت قافیہ مکرر نیز نمودہ"[2]

اسی دور کے ایک اور شاعر مولنا یحیی سبیک نیشاپوری ہین جنھون نے سلطان شاہرخ کے زمانہ مین بڑی شہرت حاصل کی، اون کے متعلق دولت شاہ لکھتا ہے،:-

"مولنا یحیی در صنائع شعر مبالغہ دارد کہ بے آن سخنوری نمیکند"[3]

اسی دور کے ایک اور مشہور شاعر آذری علیہ الرحمہ ہین، جنھون نے سلطان شاہرخ کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کے متعلق دولت شاہ لکھتا ہے،

در مدح شاہ رخ سلطان این قصیدہ در طور لغز (چیستان) می فرماید"

چیست آن آبے کہ تخم فتنہ بر می افگند

خسرو گردون ز سہم او سپر می افگند[4]

غالباً تاریخ گوئی کی ابتدا بھی اسی دور مین ہوئی، کیونکہ وہ بھی ایک صنعت ہے، اور اس دور

[1] دولت شاہ صفحہ ۳۱۸ و ۳۱۹ [2] ،، صفحہ ۴۲۱ [3] ،، صفحہ ۴۱۷ [4] ،، صفحہ ۳۹۹،

سے پہلے اوس کا پتہ نہیں چلتا، اصل یہ ہے کہ شاعری پر تمدنی اور خارجی حالات کا اثر لازمی طور پر پڑتا ہے، اور اس دور کی تمدنی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین مختلف قسم کی صناعیون نے بہت زیادہ ترقی کی تھی، یہان تک کہ امراء و سلاطین تک ان صناعیون میں کمال پیدا کرتے تھے، چنانچہ دولت شاہ سلطان احمد کے حال مین جو ۸۱۳ھ مین قرا یوسف ترکمان کے ہاتھ سے مقتول ہوا لکھتا ہے،

"در انواع ہنر چون تصویر و تذہیب و قواسی و سہامی و خاتم بندی وغیر ذلک اوستاد بودے و شش قلم خط نوشتے و در علم موسیقی داد وار صاحب فن است" [1]

اس لئے اس دور کی شاعری پر بھی یہی اثر پڑا، اور وہ لفظی صناعیون کی نمایشگاہ بن گئی، اردو زبان مین لکھنؤ کی شاعری مین جو لفظی صنائع پائے جاتے ہین، اوسکی وجہ بھی یہی ہے، کہ اس دور مین لکھنؤ مین فنون لطیفہ کو خاص طور پر ترقی حاصل ہو گئی تھی، اور مختلف قسم کے صناع پیدا ہو گئے تھے، اس لئے شعراء نے بھی ان کی تقلید کی، اور شاعری مین مختلف صنائع و بدائع سے کام لینے لگے،

لیکن ان خارجی حالات اور تمدنی اثرات کے ساتھ یہ دور فارسی شاعری کے گذشتہ دورون سے بالکل الگ اور بیگانہ بھی نہ تھا، بلکہ قدماء اور متوسطین ہی کے رنگ کلام نے اس کو پیدا کیا تھا، چنانچہ مولانا شبلی علیہ الرحمہ شعر العجم مین لکھتے ہین،

"قدماء کے کلام مین صنائع لفظی یعنی صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہین، مراعات النظیر (تناسب لفظی) کو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے، سلمان ساوجی نے رواج دیا، اور کچھ زمانہ تک بڑے زور شور سے جاری رہی،" [2]

سلمان ساوجی کے اثر سے یہ صنعت جس زمانہ مین بڑے زور شور سے جاری رہی، یہ وہی آٹھوین اور نوین صدی کا زمانہ ہے جس مین مولانا کاتبی نے نشو و نما پائی، اس لئے یہ صنعت ان کے کلام

[1] دولت شاہ ص ۳۰۶، [2] شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۲۰۸،

کی سب سے بڑی اور سب سے نمایان خصوصیت بن گئی، چنانچہ ان کا کلام کہین سے بھی اوٹھا کر پڑھو، ہر جگہ یہ خصوصیت نمایان نظر آئے گی، مثلاً

در مہر رخ سنگ دلان کوش کہ این آبست — در پلۂ اعمال گران روز قیامت

نیست از سوز من آن خسرو خوبان آگاہ — پیش شیرین خبر تلخی فرہاد برد

کاتبی در باغ رفت آن سرو برخیز و ببین — یا گل خود روے رنگین است یا خود روے او

اے کاتبی نہ دیدم جائے بہ از خرابات — تو نشنوی سخن را لیک این سخن زجائیست

مردم از یاد بنا گوش تو اے دانہ در — آب در حلقہ چشم من مسکین گردد

ہر کسے دارد بروئت روز بازاری ولیک — کاتبی را ہست با خط تو سودائے دگر

از تیغ غمزہ اوتا سینہ شد فگارم — غیر از دعائے سیفی ورد دگر ندارم

گفتی حساب میکن ہر ناوکے کہ آمد — گر تو نمیکنی کہ من راست می شمارم

مراعات النظیر کے علاوہ جابجا صنعت اضداد اور صنعت اشتقاق سے بھی کام لیا ہے، مثلاً

زاہدم گفت رند و بدنامی — نیکم آمد کہ می ستود مرا

گر بدوزخ باشم اے حور بہشت — باشد از یاد تو عذبم آن عذاب

از ساقی و شراب شفق رنگ زیر چرخ — محبوب مہربان و رفیق و شفیق نیست

ہر کرا دست بدان بازو و ساعد باشد — دولتش بندہ و اقبال مساعد باشد

سر بر دو تیغت مرا تا مہر گردد منقطع — لیک قطعاً بر نخواہد آمدن این انقطاع

ان صنعتون کے علاوہ اونھون نے اپنی مثنویون مین اور بھی مختلف صنائع کا استعمال کیا ہے چنانچہ مسٹر براؤن اپنی ہسٹری مین لکھتے ہین کہ

"مثنوی حسن وعشق، ناظر ومنظور، اور بہرام وگل اندام کو نئے نئے صنائع مین لکھا ہے،"

مثلاً ذوالبحرین، ذوالقافیتین اور اسی قسم کے دوسرے صنائع، آخری زندگی مین انھون نے خمسہ لکھنا شروع کیا، جس مین انھون نے تصنع وآرایش کو راہ دیا،

اگرچہ اس دور کے اور شعرا بھی ان صنائع کی پابندی کرتے تھے، لیکن مولانا کاتبی نے صنائع وبدائع کا استعمال اس کثرت سے کیا کہ وہ ان کی خاص طرز قرار پاگئے، اور جن لوگون نے اس طرز مین شاعری کی اس خصوصیت کی بناپر مولانا کاتبی کی طرف منسوب ہوگئے، چنانچہ تذکرہ مخزن الغرائب مین واصفی کے حالات مین لکھا ہے، کہ

"سلیقۂ شعرش موافق سلیقۂ مولینا کاتبی است امابفضل کاتبی نمی رسد"

اس کے بعد واصفی کی یہ غزل نقل کی ہے،

نرگس جادوے تو آہوی چین — نافۂ آہوے تو خال جبین،
ہندوے گیسوی تو حامی کفر — غمزۂ خونی تو ساحر دین،
صورت ابروے تو قبلہ نما — ساجد ابروے تو روی زمین،
یک سر موے تو و ملک جہان — یک گل روی تو و خلد برین،
واصفی از حسن تو دیوانہ است — مضطرب از خط تو راز حزین،

اور اس غزل کے متعلق لکھا ہے کہ اوس کو چار بحرون مین پڑھ سکتے ہین، اس تاریخی تبصرے کے بعد اب ہم ان تمام اصنافِ شعر پر ریویو کرنا چاہتے ہین، جن مین مولنا کاتبی نے زورِ طبع دکھایا ہے،

قصیدہ اس دور مین اگرچہ شاعری کے دریا کا بہاؤ زیادہ تر غزل گوئی کی طرف تھا، تاہم شاعر کے زور طبیعت کا اندازہ زیادہ تر قصیدہ گوئی سے کیا جاتا تھا، چنانچہ دولت شاہ سمرقندی مولانا

تبری نیشاپوری کے تذکرے مین لکھتا ہے،

"قصائد را محکم وپرمعانی میگوید وبعضے افاضل درکار او متحیر بودند، واورا درجواب قصائد اکابر امتحان می کردند وسخن اورا محکم می یافتند"[1]

شعرا کے زور طبع کے امتحان کرنے کا طریقہ یہ تھا، کہ مشہور قصیدہ گو شعرا کے قصائد پر ان سے قصیدے لکھواتے جاتے تھے، اس لئے لازمی طور پر ان شعرا کو انہی شعرا کا تتبع کرنا پڑتا تھا، سلطان بایسنغر نے اسی طریقہ کے موافق مولینا کاتبی سے کمال اسماعیل کے ایک قصیدہ پر جس کی ردیف نرگس تھی، قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی تھی، کیونکہ ساتوین صدی کے وہ سب سے زیادہ باکمال قصیدہ گو شاعر تھے، اوران کی قصیدہ گوئی کی خصوصیات حسب ذیل تھین،

۱- نہایت مشکل طرحین کرنا
۲- اوران مین نئے نئے مضامین پیدا کرنا،
۳- زبان کی صفائی اور سلاست وروانی،

اس لئے قدرتی طور پر مولینا کاتبی نے بھی اپنے قصائد مین یہی خصوصیات پیدا کین، مثلاً ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف شگوفہ ہے، اور اس مین نہایت کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ہین، مثلاً

چو مرغ ار تشنۂ بسمل خنجر تو — بسیخ از چہ زد جسم لاغر شگوفہ
ز بس خورد بر فرق شمشیر جنت — ازان پنبہ ہا بستہ بر سر شگوفہ
نگذشت بر شاخہا گازر آسا — بسے جامہ شستہ در بر شگوفہ
عجب نیست بر بال او نامہ چندین — کہ برپاست ہمچون کبوتر شگوفہ

[1] دولت شاہ صفحہ ۴۶۵،

کبوتر اگر نیست مرغیت بارے	کہ آمد چنین بیضہ پر در شگوفہ

اسی طرح اور بھی بہت سی مشکل زمینین اختیار کی ہین، اور ان مین بہ کثرت نئے نئے معاین پیدا کئے ہین، چنانچہ مسٹر براؤن اپنی ہسٹری مین میر علی شیر نوائی کی کتاب مجلس النفائس کے حوالے سے لکھتے ہین، کہ

"وہ اپنے وقت کو بے نظیر شخص تھے اور جس قسم کے اشعار لکھتے بالخصوص قصائد مین اچھوتے خیالات پیش کرتے اور نئی نئی ترکیبین بڑی کامیابی کے ساتھ ایجاد کرتے"،

ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی ردیف گوہر ہے، اور اس مشکل زمین مین زبان کی سلاست و روانی کو جس خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے، اس کا اندازہ اس قصیدہ کے منتخب اشعار سے ہو سکتا ہے،

اے دم خندۂ زیا قوت تو پیدا گوہر	نیست در بحر دو عالم چو تو یکتا گوہر
ماندہ ام از لب و دندان تو بے کام کہ ہست	مشتری مفلس و بائع شدہ و کالا گوہر
بر سر کوے تو گر خلق بسنگم بزنند	بہ کہ سازند نثار مرد بدگر جا گوہر
چون صدف چشم ترم شد بفراق تو سفید	بسکہ افشاند بہر گوشہ ز سودا گوہر
آنکہ بر میدمد از سیم رخت نیست عرق	بحر حسنت وجود تو و آنہا گوہر

قصیدہ کا ایک بڑا حسن مخلص یعنی گریز ہے، اور مولینا کاتبی نے اس تشبیب کے بعد گریز کا کس قدر لطیف پہلو پیدا کیا ہے،

ہر کرا مادح خواجاست زبان چون دہنت	زیر گوہر بود وش دائم و بالا گوہر

اخیر قصیدہ مین اس ردیف کے اختیار کرنے کی کسقدر عمدہ شاعرانہ توجیہ کی ہے،

بہر ایثار رہت کاتبی بے زر و سیم	از ردیف سخنان کردہ مہیا گوہر

سب سے اخیر مین دعائیہ شعر ہے:-

دل دوست تو بجانا وکہ ہمچون بحر مین	میزند موج از ایشان دم انشا گوہر

یہ تمام محاسن کلام تو ادبی حیثیت رکھتے ہین، لیکن ہمارے نزدیک قصیدہ گوئی بلکہ ہر صنف شعر کا اصلی حسن جوش بیان ہے، اور اس کا اظہار مولینا کاتبی کے ان قصائد سے ہوتا ہے، جو مذہبی حیثیت رکھتے ہین،[1] مثلاً ایک قصیدہ جناب امیر علیہ السلام کی شان مین لکھا ہے، اور اس مین ان کے حسن عقیدت نے جوش بیان اور سلاست محاورہ و زبان کو حد کمال تک پہونچا دیا ہے، چند شعر اس قصیدہ کے ملاحظہ ہون،

اے جان سخن ز دست و دل بوتراب کن	آباد ساز کعبہ و خیبر خراب کن
خاک عدو بباد دہ از گرد دلدلش	وز ذکر تیغ او جگر خصم آب کن
با ہر کہ آن جناب گرفت انس انس گیر	وز ہر چہ اجتناب نمود اجتناب کن
شاہا! درآ بہ معرکہ وز گرد دلدلت	آہوے چرخ را ہمہ تن مشک ناب کن
بردار تیغ و روے زمین ساز بحر خون	وان بحر را ز کاسۂ سرہا حباب کن
اے خضر بہر تشنۂ صحراے کربلا	آب حیات در قدح آفتاب کن
اے بادشاہ خیل عجم وقت کوشش است	لشکر کشاے تخت عرب را شتاب کن
اے شہسوار معرکۂ آخر الزمان	از دست رفت معرکہ پا در رکاب کن
در عرصہ تا ز حصن ز رستم ستان بگرز	رخ از ستون خیمۂ افراسیاب کن
در راہ سالکان نہی پاے دل ضعیف	این شیشہ ہاے جملہ تہی پر گلاب کن
این باغ نظم را کہ پر از نور معنویست	وقف جناب آن شہ جنت مآب کن
وصف جناب عالی آل علی بگو	خود را ز ذروۂ مرتبہ عالی جناب کن

[1] مولینا کاتبی کے اکثر قصائد مذہبی شان رکھتے ہین، تذکرہ آتشکدہ مین ہے کہ قصائد در مناقب بسیار گفتہ،

ہمچون شفق ز فرقت خورشید آل او — داماں چرخ پر ز عقیق مذاب کن

غزل ساتوین صدی مین خواجہ حافظ سے پہلے حضرت امیر خسرو اور حسن دہلوی اپنی غزلوں مین زیادہ تر صرف عشق و محبت کے خیالات اور جذبات ظاہر کرتے تھے، ان کے بعد خواجوے کرمانی نے اس طرز مین تغیر پیدا کیا، اور دنیا کی بے ثباتی و سیع المشربی اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا،[1] اور خواجہ حافظ نے انہی مضامین پر اپنی غزلگوئی کی بنیاد رکھی، اور ان مین زیادہ تنوع اور رنگینی پیدا کی، اس معنوی تغیر کے ساتھ سلمان ساوجی نے غزل کو صنائع لفظی سے بھی روشناس کیا، اور خواجہ حافظ نے بھی جابجا اس معاملہ میں ان کی تقلید کی، غرض خواجہ حافظ اور سلمان ساوجی کے زمانہ مین غزل مین لفظی اور معنوی دونوں حیثیتون سے تغیرات پیدا ہو گئے، خواجوے کرمانی نے جو معنوی تغیر پیدا کیا تھا، اوس کے لحاظ سے غزل صرف عشق و محبت کے جذبات و معاملات تک محدود نہین رہی، بلکہ ہر قسم کے اخلاقی اور صوفیانہ مضامین، اور رندی و سرمستی کے خیالات اس میں شامل ہو گئے، سلمان ساوجی نے لفظی صنائع کی جو بدعت جاری کی تھی، اوس نے آٹھوین اور نوین صدی میں اس قدر ترقی کرلی کہ اس دور کی غزلون پر لکھنو کے دور آخر کی اردو غزلگوئی کا دھوکا ہوتا ہے، مولینا کاتبی کی شاعری کا یہی دور ہے، اس لئے یہ دونون خصوصتین ان کی غزلون مین نمایاں طور پر نظر آتی ہین لفظی صنائع و بدائع میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین، وہ بالکل سلمان ساوجی کے معتقد ہین، بلکہ اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتے ہین، چنانچہ فرماتے ہین:۔

آن قوم کہ در دعوی از جانب سلمانند — در معرض شعر من از بہر چہ می آیند
شعر من روشن دل و انگہ سخن سلمان — من ہیچ نمی گویم مردم ہمہ بنمایند

سلمان ساوجی کی اس تقلید نے جابجا ان کی غزلوں کا وہی رنگ کر دیا ہے جو لکھنو مین

[1] شعر العجم حصہ دوم ص ۲۳۰،

ناسخ اور تلامذہ ناسخ کا تھا، مثلاً

خیال خط تو در دیدہ پر از پیکان — چو طوطے است کہ باشد در آہنین قفسے
شیر مردان را بدور آہوان چشم تو — خاک شد ہر استخوان در کنج صحرا وگر
ہر کروے چون مہت را شمع خواند یا چراغ — دمبدم او را میان سر بباید کرد داغ
گر حدیث از پستہ او آبدار آمدہ شد — در عرق تر گردد آنکس کو نشنید جاتنگ

اس لفظی خصوصیت کے ساتھ خواجوے کرمانی اور خواجہ حافظ نے مضامین غزل مین جو تنوع اور بوقلمونی پیدا کی تھی، اس کا اثر بھی اس دور کی غزل گوئی پر پڑا، اور مولینا کاتبی نے خصوصیت کے ساتھ اپنی غزلون مین ہر قسم کے رندانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ادا کئے، چنانچہ ہم ہر قسم کے مضامین کے منتخب اشعار بطور مثال کے آیندہ درج کرینگے، (باقی)

علمائے نگرام

از

مولوی مطلوب الرحمن صاحب ندوی نگرامی

قصبۂ نگرام ضلع لکھنؤ کی تاریخ بڑی حد تک نامعلوم ہے، پھر بھی اہل خبر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ صدیوں سے اس سرزمین کو علما کے وطن اور علم و دین کے خدمت گذارون کے گہوارہ ہونیکا شرف حاصل ہے، تین سو سال پہلے کی تاریخ ایک راز سربستہ ہے، البتہ ڈھائی تین سو سال کے اندر جن بزرگون کو علم و معرفت کی نعمت ملی، ان کی زندگی اجمال یا تفصیل کیساتھ سامنے ہے، جن کے مبارک تذکرہ کو ہم اُس ذات والاصفات کے حالات سے شروع کرتے ہین، جس کے علم و فضل کا آفتاب اسی سرزمین پر طلوع ہوا، لیکن اسکی شعاعون نے اودھ سے دہلی تک نہ معلوم کتنے ظلمت کدون کو روشن کر دیا، ہماری مراد حضرت مولینا نظام الدین صاحبؒ سے ہی۔

مولنا نظام الدین صاحبؒ سرزمین نگرام کو حضرت مولنا کے مولد اور وطن ہونے کا شرف حاصل ہی، ہرچند کہ بعض ارباب سیر نے آپکے وطن کی تعیین میں بہت زیادہ ابہام کو دخل دیا ہی، لیکن حقیقت یہی ہے، کہ آپ نگرام ہی کے رہنے والے تھے، جیسا کہ حضرت مولینا محمد ادریس صاحب نگرامیؒ جو ایک محقق عالم اور نہایت ہی متورع بزرگ تھے، اپنی ایک قلمی یادداشت میں لکھتے ہین،

"صاحب مناقب المحبوبین از مراۃ ضیائی می نویسد کہ نسب ایشان (مولینا نظام الدین صاحبؒ) بحضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ می رسد و ساکن قصبہ کاکوری و بقولے نگرام کہ از مضافات لکھنؤ است بودند و بزرگان ایشان از ولایت آمدہ در آنجا سکونت اختیار کردند وہم وے از مخبر الاولیا می نویسد کہ مولد و موطن ایشان قصبہ نگرام بود کہ متصل انتہی صوبہ اودھ است[1]"

سن ولادت نامعلوم ہے، ابتدائی نشو و نما نگرام ہی میں ہوئی، سن رشد کو پہونچے، تو حضرت ملا احمد المعروف بہ ملا جیونؒ کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے، دہلی پہنچکر علوم کی تکمیل فرمائی، پھر ایک طرف خود اپنے علم کا دریا بہایا، اور دوسری طرف علم و معرفت کے اُن بہتے ہوئے سمندرون سے عرصہ تک سیرابی حاصل کرتے رہے، جو اس وقت دہلی میں موجیں مار رہے تھے، حضرت مولانا شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادیؒ کی خدمت مین حاضری دی، اور علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ سے کسب فیض کیا، اور شرف بیعت سے بھی مشرف ہوئے، پھر شاہ صاحب کے حکم کے بموجب آپ نے اورنگ آباد کا قصد فرمایا، اور وہین کے ہو رہے، نظام الملک کو حضرت مولنا نظام الدین صاحبؒ سے غایت درجہ عقیدت تھی، اور وہ ہزار ہا روپیہ خدمت والا مین بطور نذر پیش کرتا تھا، جو آپ طالب علمون اور حاجت مندون کی اعانت میں صرف فرما دیا کرتے تھے، علم و فضل کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی، چنانچہ طالبان علم دور دراز کی منزلین طے کر کے آتے اور درس میں شریک ہوتے، چونکہ مسلمانون کی عام اصلاح و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری تھا، اسلئے ہر وقت مریدین و معتقدین کا ہجوم رہتا، مریدون کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی تھی، ۱۱۴۲ھ میں ایک قرضدار نے آپ کو شہید کر ڈالا، اور آپ اورنگ آباد ہی میں مدفون ہوئے، آپ کی تصانیف مین رسالہ نظام القلوب سلوک و تصوف کے عنوان

---

[1] تاریخی شہادتون کے علاوہ اس بات سے بھی ہمارے بیان کو تقویت پہونچتی ہے، کہ نگرام مین اب تک آپ کے ہم خاندان افراد موجود ہین، ہرچند کہ ان کا دامن علم و عرفان کی متاع گرانمایہ سے خالی ہے، لیکن اُن کے پاس مولانا نظام الدین صاحبؒ کی دستخطی تحریریں موجود ہین، جن مین مولینا نے اپنے اور ان کے ہم جد ہونے کا اقرار فرمایا ہے،

پر بہترین تصنیف ہے،

مولینا فخر الدین صاحب آپ حضرت مولینا نظام الدین صاحبؒ کے فرزند ارجمند ہیں، پیدایش اورنگ آباد
ہی کی ہے، ابتدائی نشو ونما اور تعلیم و تربیت والد ماجد ہی کی نگرانی میں ہوئی، چند سال کے بعد دہلی
تشریف لائے، اور یہان وقت کے اکابر اور مشائخ سے استفادہ فرمایا، یہ وہ وقت مسعود تھا، جب کہ
حضرت حجۃ الاسلام شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا دریاے فیض جاری تھا، کہا جاتا
ہے کہ آپ نے شاہ صاحب سے علم حدیث میں شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے، لیکن اسکی کوئی تاریخی سند نہیں ہے،
البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کو علم حدیث سے خاص شغف تھا، اور اس شغف کا حال آپ کی تصنیف فخر الحسن
کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، اس کتاب مین آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حسن بصریؒ
کے لقا کے متعلق عالمانہ بحث کی ہے، اور علامہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس خیال کی تردید
فرمائی ہے، کہ حضرت حسن بصری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شرفِ لقا حاصل نہ تھا، یہ تو معلوم ہے، کہ
اس وقت کتبِ حدیث نایاب تھیں، لیکن اس کے باوجود آپ کی اس تصنیف مین متداول کتبِ احادیث
اور ان کی شروح کے علاوہ تاریخ صغیر بخاریؒ، تہذیب الکمال مزی، شروط الائمہ حازمی، تہذیب
الاسماء واللغات نووی، سنن کبری بیہقیؒ، حلیۃ الاولیاء، تاریخ خطیب بغدادیؒ، تقریب نووی، تاریخ
الاسلام ذہبیؒ، مراۃ الجنان یافعیؒ، سنن دار قطنی، کتاب الثقات ابن حبان، فتح الباری، تدریب الراوی،
منہاج السنہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کے حوالے موجود ہین، جو آپ کے شغف، کثرتِ اطلاع اور تلاش و تفحص کی بین
دلیل ہین، آپ کی یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی، مولنا حسن الزمان صاحب حیدر آبادی نے القول المستحسن
کے نام سے اسکی شرح بھی لکھی ہے، شرفِ بیعت آپ کو بھی مثل اپنے والد کے حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب
جہان آبادی سے حاصل تھا، انکو مرشد کے حسب الحکم دہلی ہی مین قیام فرمایا اور عرصہ تک آپ کی ذاتِ
علم و معرفت کا فیض جاری رہا، دہلی کے خاندانِ شاہی میں آپ کو بڑی مقبولیت اور پذیرائی حاصل تھی،

خاندان شاہی کے اکثر افراد اور خود بادشاہ آپ سے بیعت تھے، سماع کے قائل ہی نہین، بلکہ دلدادہ تھے،
سونے چاندی کے چھلے اور انگوٹھیان پہننے مین کوئی باک نہ تھا، اور نہین معلوم کہ وہ ان چیزون کے جواز
پر کیا دلیل رکھتے تھے، یا یہ ایک خامی تھی، جو امراء و سلاطین کی صحبت میں پیدا ہو گئی تھی، با این ہمہ مزاج
میں سادگی تھی، عوام اور غریب مسلمانون سے نرمی اور محبت سے ملتے، عاجزی اور فروتنی میں سلف کی
ایک مثال تھے، ایک بار دلی کے کسی منچلے کو دلی کے بزرگون کے امتحان کی سوجھی، مرزا مظہر جان جانان،
شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولینا فخر الدین صاحبؒ کو دن کے کھانے پر مدعو کیا، اور یہ کہدیا کہ آپ سب
حضرات ٹھیک دس بجے غریب خانہ پر تشریف لے آئین، یہ تینوں حضرات وقتِ مقررہ پر پہونچے، میزبان
سے ملاقات ہوئی، اس نے عزت و احترام سے بٹھالا، اور کہا تشریف رکھئے، ابھی کھانے کی تیاری
میں کچھ دیر ہے، یہ حضرات انتظار کرتے رہے، لیکن کھانے کو تیار نہ ہونا تھا، نہ ہوا، ظہر کے وقت
میزبان صاحب تشریف لائے اور معذرت کرنے لگے، کہ حضرت کیا کہین، بڑی کوشش کی لیکن کچھ
انتظام نہ ہو سکا، پھر جیب سے دو دو پیسے نکال کر تینوں صاحبون کے سامنے نذر پیش کی، اور کہا حضرت
اسی کو دعوت تصور فرمایئے، مرزا صاحب کا مزاج بہت نازک تھا، چہرے کا رنگ بدل گیا، غصے
میں اٹھے اور گھر روانہ ہوگئے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولنا فخر الدین صاحبؒ نے پیسون کو
آنکھون سے لگایا، سر پر رکھا، اور بڑی دیر تک میزبان کو تسلی اور دلاسا دیتے رہے، کہ تم کبیدہ خاطر
نہ ہونا، ہم تمھاری اس مدارات سے بہت خوش ہوئے، اور پھر خوشی خوشی وہان سے رخصت ہوئے،
۱۱۹۹ھ میں آپ نے انتقال فرمایا، دہلی مین بیرون دروازہ قطب صاحب آپ کی قبر موجود ہے،
سلوک میں سلسلہ فخریہ کا انتساب آپ ہی کی ذاتِ والا صفات کی طرف ہے،

مولینا حافظ علیم اللہ صاحب شائق حافظ قرآن، عالم متبحر اور متوکل بزرگ تھے، علوم معقول و منقول
کی سند فرنگی محل سے حاصل کی، تحصیل علم سے فراغت ہوئی، تو درس و تدریس کا مشغلہ رہا، اور ہزارہا

تشنگان علم اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے طرزِ عمل نہایت ہی سنجیدہ اور دلنشین تھا، چنانچہ اسی حسن صحبت کی شہرت سن کر مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک، امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ نے آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، اور عرصہ تک آپ کی خدمت مین رہکر تحصیلِ علم کی عزت حاصل کرتے رہے، امین الدولہ کو جب منصبِ وزارت حاصل ہوا، تو بارہا اقبالمند شاگرد نے یہ تمنا ظاہر کی، کہ استاد محترم کبھی اپنے قدمون سے مس کرکے مسندِ وزارت کو اعزاز بخشیں، لیکن حافظ صاحب کی مستغنی اور غیور طبیعت نے اسے کسی طور پر گوارا نہ فرمایا، اور ہمیشہ بلطائف الحیل انکار فرماتے رہے، مولینا عبدالرحمن صاحب مجذوب چشتی لکھنوی رح سے آپ کو شرفِ بیعت حاصل تھا، اور آپ کا شمار ان کے مخلص مریدین مین تھا، آخر عمر مین درس و تدریس کا سلسلہ منقطع فرما دیا تھا، اور ہر آن یادِ الٰہی مین مشغول رہتے تھے، شعر و سخن سے دلچسپی آغاز شباب سے تھی، شائق تخلص فرماتے تھے، کلام زیادہ تر حمد و نعت میں ہوتا، ایک نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہین،

والشمس بیاضِ سحرِ روے محمد   واللیل سوادِ شبِ گیسوے محمدؐ

والشمس بود جلوۂ رویش و ضحٰہا   واللیل اذا عسعس گیسوے محمدؐ

نورِ سحرِ عید و تجلی شبِ قدر   آن روے محمد بود این موے محمدؐ

ہر دم ہدفِ تیر تمنا دل پاکان   قربان کمانِ خم ابروے محمدؐ

بوبکرؓ و عمرؓ حضرت عثمانؓ و علیؓ ہم   پیوستہ چوں ہر حرف بہر خمے محمدؐ

سبحان زہے شانِ معلی و معظم   جبریل بہ حیرت ز تگاپوے محمدؐ

العظمة للہ زہے رتبۂ عالی   معراج ملائک بہ سرکوے محمدؐ

نگرام بیاید اثرِ خاکِ مدینہ   اے ہر دو جہان رحمت مملوے محمدؐ

شائق ہمہ تن چشم بہ امید لقاے   ہر دم بہ تصور نگران سوے محمدؐ

اپنے مرشد حضرت مولینا عبدالرحمن صاحب چشتی رح کے سانحۂ ارتحال پر تاریخ کہی،

صوفی صاف دل خدا آگاہ   عبدالرحمن عاشق اللہ،

آخر جمعہ سادس ذیقعدہ   سوے باغِ ارم گرفتہ راہ

سالِ ترحیل آن مقربِ حق   جستہ از ہاتفے علیم اللہ

گفت تا یحزنون بہ دل ہوش   آیت ان اولیاء اللہ

۱۲۴۵ھ

آپ کی وفات ۱۲۵۵ھ میں ہوئی،

مولنا حافظ عبدالعلی صاحبؒ

سرزمین نگرام علم و معرفت سے آشنا تو ایک عرصہ سے تھی، لیکن قدرت کو اب یہ منظور تھا، کہ علم و معرفت کو اس کے حقیقی مرتبہ اور منزلت مین جلوہ گر کرے، اور جو لوگ اب تک کتاب اللہ اور سنت رسول کو محض خیر و برکت کا ایک ذریعہ سمجھ رہے تھے، انھیں بتا دے کہ یہ صندوقون اور الماریون مین بند ہونے صرف اوراد و وظائف کے لئے نہیں ہین، بلکہ انہی کے اندر ہماری دنیا اور دین کی سرافرازی کا راز مضمر ہے، چنانچہ پروردگارِ عالم نے علم و عمل حکمت و معرفت حق گوئی و حق کوشی جیسی بے شمار صفتون سے ممتاز و مفتخر فرما کر مولینا عبدالعلی صاحب کو ایک وسیع حلقہ کی ہدایت و رہنمائی کے لئے پیدا فرمایا،

ولادت باسعادت ۱۲۳۱ھ مین ہوئی، اپنے ماموں حافظ علیم اللہ صاحبؒ سے جنکا ذکر اوپر کی سطرون مین گذر چکا ہے، بسم اللہ کی کچھ شد بد پڑھنے کے بعد حفظ قرآن شروع کیا، جو بخیر و خوبی انجام کو پہونچا، پھر کچھ دنون اپنے ماموں صاحب سے تحصیلِ علم فرماتے رہے، اسی زمانہ مین آپ کو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ کی رفاقت حاصل ہوئی، اور جب تک اپنے ماموں سے پڑھتے رہے، امین الدولہ کا ساتھ رہا، پھر آپنے علوم دین کی تکمیل کیلئے وقت کے مشاہیر کی خدمت میں حاضری دی، اور لکھنؤ مین مقیم علماء سے شرف تلمذ حاصل کیا، جن مین مولنا حسن علی صاحب صغیر محدثؒ، مولنا انور علی صاحب مرادآبادیؒ، مولانا محمد معین الدین صاحب فرنگی محلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، علوم ظاہری کی تکمیل و تحصیل کے بعد آپنے

علوم باطن کی طرف توجہ فرمائی، اور حضرت قاضی عبد الکریم صاحبؒ کی خدمت مین حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا، قاضی صاحب نے آپ کو دیکھکر فرمایا، کہ یہ لڑکا بڑا عالی مرتبہ ہوگا؛

بالاے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

پھر اپنے خلیفہ جناب گلزار شاہ صاحبؒ سے فرمایا، کہ "اس لڑکے کا خیال رکھنا" چنانچہ حضرت قاضی عبد الکریم صاحبؒ کے وصال کے بعد گلزار شاہ صاحبؒ آپ کی باطنی تربیت فرماتے رہے، اور شیخ کے حکم کی تعمیل مین حضرت مولینا عبد العلی صاحب کے سینہ کو اسرار و حکم کا گنجینہ بنا دیا، باوجود اس کے کہ امین الدولہ وزیر سلطنت اودھ حضرت مولینا کے بچپن کے ساتھی اور رفیق درس تھے، اور اس وقت دربار شاہی مین ان کا طوطی بول رہا تھا، مولٰنا نے کبھی بھی تلاش معاش کے سلسلہ مین ان سے کوئی امداد و اعانت طلب نہین کی، ایک روز حضرت مولینا لکھنو کی ایک سڑک سے گذر رہے تھے، کہ نقیبون کی آواز کان مین آئی جس کا مطلب یہ تھا، کہ وزیر سلطنت کی سواری آرہی ہے، راستہ چلنے والے راستہ صاف کردین نقیب بار بار وزیر سلطنت کی آمد آمد کی صدا بلند کر رہے تھے، اور خلقت راستہ چھوڑ کر وزیر سلطنت کے زیارت کے شوق میں دورویہ کھڑی ہوتی جاتی تھی، مولنا بھی ایک طرف کھڑے ہوگئے، کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ سواری سامنے آئی، امین الدولہ کی نظر حضرت مولانا پر پڑی، فوراً اپنے بچپن کے ساتھی کو پہچان گئے، سواری کو رکنے کا حکم دیا، اور حضرت مولنا سے بغلگیر ہوگئے، بڑی دیر تک آپس میں عرصہ سے ملاقات نہ ہونے کے شکوہ و شکایت کا سلسلہ رہا، مولینا نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا، امین الدولہ نے دربار وزارت کو سرفراز فرمانے کا وعدہ لے لیا، اور رخصت ہوئے، دوسرے دن مولنا امین الدولہ کے محل پر تشریف لے گئے، زندگی شروع ہی سے اسلامی سادگی کا نمونہ تھی، گاڑھے کا ایک کرتہ، اور گاڑھے کا پائجامہ جسم پر تھا، معمولی

چمڑے کے دیہاتی جوتے پیر میں تھے، پاپیادہ چل کر آنے کے باعث پیرون پر گرد چڑھی ہوئی تمام درباری آداب و ملحوظات کو بالاے طاق رکھکر محل کے اندر داخل ہوئے، امین الدولہ اپنے استادزادہ اور رفیق درس کو آتے دیکھکر استقبال کے لئے سروقد کھڑے ہوگئے، اعیان دربار کو حیرت تھی کہ آخر یہ کون شخص ہیں، جن کی یہ تکریم و منزلت ہو رہی ہے، کہ جس مسند پر بڑے بڑے امرار و رؤسا اپنا سر نہیں رکھ سکتے تھے، وہ ان کے قدمون کے نیچے ہے، اثنائے گفتگو میں امین الدولہ نے کئی بار باصرار کہا، کہ آپ مجھ سے کچھ طلب کرین، لیکن مولینا اس سوال پر ہر بار خاموش رہے، آخر امین الدولہ نے منگرائل ضلع اناؤ کی تحصیلداری مولینا کی خدمت مین پیش کی اور کچھ اس طرح اصرار فرمایا، کہ مولانا انکار نہ فرما سکے، لیکن قدرت کو آپ سے دین متین کی خدمت لینی منظور تھی، ابھی آپ کو منگرائل گئے ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے، کہ نگرام کے رہنے والے ایک خدارسیدہ بزرگ میان خدا بخش جن کو حضرت مولینا شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی ہمنشینی کا شرف حاصل تھا، منگرائل پہونچے، حضرت مولنا سے ملے، اور شفقت و محبت سے فرمایا،

"حضرت پروردگار عالم نے آپ پر بڑا احسان فرمایا، کہ علم دین کی نعمت عطا فرمایا، یہ منصب و عہدہ آپ کے اس مرتبہ سے بہت فروتر ہے، جس پر اللہ نے آپ کو فائز کیا ہے، اگر آپ لوگ بھی مخلوق خدا کی رہنمائی نہ فرمائین گے تو ہم جیسے مسلمانون کا تو خدا ہی حافظ ہے، تقرب سلطانی حاصل کرنے کے لئے تو حکومت کی سرکاری زبان فارسی کافی تھی آپ نے علم دین حاصل کیا ہے تو کچھ دین کی خدمت کیجئے"؛

ان الفاظ میں بلا کا اثر تھا، حضرت مولینا عبد العلی صاحبؒ نے اسی وقت استعفا لکھا، اور لکھنو روانہ ہوگئے، استعفا امین الدولہ کے سامنے پیش کیا، امین الدولہ کہنے لگے، مولینا مجھے پورا احساس ہے، کہ آپ کے علم و فضل کے اعتبار سے یہ عہدہ بہت ہی فروتر ہے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہون کہ اسی

ہفتہ میں موجودہ عہدہ سے کہیں بلند عہدہ خدمتِ والا میں پیش کرنے کا فخر حاصل کرون گا، مولینا نے فرمایا آپ کی محبت کے گہرے نقوش ابد الآباد تک میرے دل میں موجود رہین گے، رہ گیا ملازمت کا معاملہ تو اس کے لئے گذارش یہ ہے، کہ اگر اب آپ اپنی جگہ بھی مجھے عنایت فرمائین، تو مجھے منظور نہیں، میں اب تک انتہائی غفلت میں تھا، خدا کا شکر ہے کہ اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں، اور میں اپنے رب سے عہد کرچکا ہون کہ اب عمر کا ایک ایک لمحہ دین کی خدمت اور پروردگار کی رضاجوئی میں صرف کرون گا" امین الدولہ نے مولینا کو رخصت کیا اور سالانہ ایک معقول رقم کا وظیفہ مقرر کر دیا،

استعفے کے بعد مولینا کی ایک بالکل نئی زندگی شروع ہوتی ہے، ذاتی تقوی اور طہارت کے ساتھ اب ہر وقت یہ فکر دامنگیر تھی کہ کسی طور پر ہر مسلمان کتاب وسنت کا پیرو نظر آنے لگے، اس سلسلہ میں آپ نے وانذر عشیرتک الاقربین کے حکم اور سنت کے مطابق سب سے پہلے تبلیغ وارشاد کا کام اپنے خاندان ہی سے شروع کیا، خاندان میں بیسیون بدعتیں جاری تھیں، ان کے استیصال کے لئے وعظ وپند کا سلسلہ جاری کیا، مخالف قوتیں سرگرم پیکار ہوئین، لیکن بالآخر حق غالب ہوا، شر وفساد کی بدلیان چھٹتی گئیں اور کچھ دنون کی پیہم سعی وکوشش کے بعد اس آفتابِ رشد وہدایت کی کرنون نے تاریک گھر میں ایمان وعرفان کا اجالا پھیلا دیا، بڑا مسئلہ عزاداری کی روک تھام کا تھا، اسلئے کہ خاندان کے کئی افراد سلطنتِ اودھ میں اونچی اسامیون پر ممتاز تھے، اور سلطنت مین تقرب حاصل کرنے کے لئے بڑے تزک واحتشام سے ہر سال مراسمِ تعزیہ داری انجام دیتے تھے، لیکن اس معاملہ میں بھی پروردگار عالم نے ظفر مند فرمایا، "امام باڑہ" جو مراسمِ عزاداری اور اُس کے ساز وسامان کے لئے خاص تھا، حضرت مولینا رح کے بڑے داماد کے مکان مسکونہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا، اور چار دیواری کے اندر جہان سال کے سال نوحہ وماتم اور سوزخوانی ہوا کرتی تھی، وہان اب شب وروز نماز وتلاوتِ قرآن مجید کی دھوم دھام تھی برے بوڑھون کی زبان آج بھی اس مکان کا نام "امام باڑہ" ہی پڑا ہوا ہے،

اعزا واقربا مین اصلاح وارشاد کا صور پھونکنے کے بعد لینذر ام القرئ ومن حولہا کی سنت کے بموجب مولینا کا پیام اصلاح اہلِ قصبہ اور اس کے قرب وجوار کے بسنے والوں تک پہونچا، اور رفتہ رفتہ آپ کی دعوت وتبلیغ کو پذیرائی حاصل ہوتی گئی، علماء اور اہلِ دانش تو عرصہ سے اس گوہر گرانمایہ کی قدر وقیمت سے واقف تھے، لیکن اب عوام وخواص سب میں آپ کے علم وفضل زور بیان وطلاقت لسان کے چرچے تھے، اور ہر گھر میں آپ کی پاکبازی وپرہیزگاری کا شہرہ،

ہر کجا چشمہ بود شیرین

مردم و مور و مار گرد آیند

رائے بریلی، بارہ بنکی، فیض آباد، جونپور، سلطانپور، پرتابگڈھ، اناؤ کے اضلاع سے جوق جوق لوگ کھنچ کھنچ کر آتے، سر آنکھوں پر اپنے گھر لے جاتے، گناہون سے توبہ کرتے، اور بیعت سے مشرف ہوتے تائید ربانی قدم قدم پر ساتھ تھی، جس گھر میں قدم رکھا، شرک وبدعت سے اُسے پاک کر دیا، جس نے بیعت کیلئے ہاتھ پکڑا، اُسنے عرفان کی دولت لازوال پائی یہ وہ زمانہ تھا، جب مولینا خواجہ احمد صاحبؒ کا فیض ارشاد انہی اضلاع میں جاری تھا، مولنا خواجہ احمد صاحبؒ نے مولیناؒ کے علم وفضل اور خالص اسلامی زندگی کی بڑی قدر کی، اپنے متوسلین ومعتقدین کو اکثر ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ مولنا عبد العلی صاحبؒ کی طرف سلوک کی مشکلات میں رجوع کرتے ہین، ان دونون بزرگون کے اتحاد مذاق اتحاد عقائد اور اتحادِ عمل نے ان کی زندگی تک ان اضلاع میں کتاب وسنت کے پرچم کو سر بلند رکھا، اور اتباعِ کتاب وسنت کی ہمہ گیری نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یاد تازہ کر دی،

حق گوئی آپ کی صفات مین ایک نہایت ہی ممتاز صفت تھی، بڑے بڑے امراء ورؤسا کی محفل مین جب وعظ وپند کا موقع ملتا، تو ہمیشہ آپ انہی نقائص کی اصلاح کے لئے وعظ فرماتے، جن میں یہ امراء مبتلا ہوتے، تعلقہ دارانِ شیعہ ضلع بارہ بنکی (اودھ) آپ کے بہت زیادہ گرویدہ اور معترف تھے، اور آپکی

خدمت اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے، لیکن رسمی طور پر عزاداری کیا کرتے تھے، ایک روز حضرت مولانا سے وعظ کہنے کے لئے درخواست کی، مولانا نے وعظ کہا، اور دل کھول کر عزاداری کی مذمت فرمائی اور اس سلسلہ مین جو مشرکانہ اور مبتدعانہ افعال کئے جاتے ہین، ان پر تنبیہ کی! تعلقدار صاحبان طمانیتِ خاطر کیسا تھ سنتے رہے، اور ندامت سے سر بگریبان تھے تعلقداران شیعہ کے اخلاف اب تک فرماتے رہتے ہین، کہ ہمارے خاندان کے عقائد کی اصلاح حضرت مولنا عبد العلی صاحب بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ کی رہین منت ہے۔

اس زمانے مین کچھ مناظرہ اور مکالمہ کا بھی عجب دستور تھا، ہر طرف مسائل مختلف فیہ مین مناظرہ کا بازار گرم تھا، ہر چند کہ مولنا رح طبعاً ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے تھے، لیکن بعض مرتبہ حالات کا تقاضا ہی یہ ہوتا تھا، کہ اسے گوارا کر لیا جائے، چنانچہ آپ کو بھی مولانا فضل حق صاحب خیرآبادیؒ، مولوی مظہر کریم صاحب دریابادی مولوی محمد عسکری صاحب کڑوی وغیرہ سے مختلف مسائل میں مناظرہ کرنا پڑا جن مین فریق مخالف نے آپ کے تبحر علم طریق استدلال زور بیان اور طلاقتِ لسان کا ہمیشہ اعتراف کیا ایک بار کوئی مولوی صاحب ادعائے علم مین ایسے وارفتہ ہوئے، کہ باوجود حضرت مولنا کے پیہم انکار کے مناظرہ کی تاریخ کا اعلان کر دیا، خیال یہ تھا کہ مولنا یونہی انکار فرماتے رہین گے، اور مجھے اول تو مسلمانون میں اپنے مسلک کے رواج دینے کا موقع ملے گا، دوسرے مولنا کے تبحر علم کا جو شہرہ ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا، معاملہ کی نزاکت کو دیکھکر حضرت مولنا کے مخلصین نے عرض کیا کہ حضرت یہ موقع آپ کی خاموشی کا نہین ہے، اگر آپ خاموش رہین گے، تو مخالفین کو غلط فہمیان پیدا کرنے کا پورا موقع ہاتھ آجائے گا، چنانچہ مولنا مجلس مناظرہ میں تشریف لائے، مسلمانون کا اچھا خاصہ مجمع تھا، مولوی صاحب جو مناظرہ کے لئے بہت زیادہ بے تاب تھے فرمانے لگے، مولنا آج ہی تو معلوم ہوگا، کہ "مُناظِرہ" کسکو کہتے ہین، مولنا نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا، حضرت پہلے لفظ صحیح استعمال فرمائیں لفظ مُناظَرہ ہے "مُناظِرہ" نہین ہے، مولوی صاحب نے فرمایا جی ہان، "غَلطی" ہوئی، مولنا نے پھر گرفت کی اور فرمایا، "صحیح لفظ غَلَطی ہے، غلطی نہین ہے"

مولوی صاحب محجوب ہو کر فرمانے لگے، جی ہان "خیال نہیں رہا، مولنا نے پھر اصلاح فرمایا، صحیح لفظ خیال ہے خِیال نہیں، اس پے در پے لفظی گرفت نے کچھ ایسا رنگ جمایا کہ مناظرہ کی نوبت ہی نہیں آئی، اور مجمع سے پیہم آوازین آنے لگین کہ جب مولوی صاحب کا تلفظ تک صحیح نہیں ہے، تو یہ مولانا سے مناظرہ کرنے کی اہلیت ہی کب رکھتے ہیں؟ حضرت مولانا رح کی طبیعت ذکی اور ذہن بہت رسا تھا، اکثر سوالات کا جواب برجستہ اس انداز میں دیدیا کرتے کہ مخالف سے مخالف بھی داد علم و واقفیت دیے بغیر نہ رہتا، ایک شیعہ مجتہد نے آپ سے ایک بار اصحابی کالنجوم کے متعلق کچھ اشکالات پیش کئے، آپ نے اس کا جو برجستہ جواب دیا ہے، اُسے اپنے ایک خط میں اپنے بھتیجے حافظ عبد الحی صاحبؒ کو یون لکھتے ہین،

"نخت جگر نور بصر سعید احق شیخ عبد الحی طول عمرہٗ بعد دعاے اہتدائے صراط مستقیم و عقیدۂ قویم آنکہ دیروز شخصے امامیہ بیان کرد کہ صحابہ را در حدیثے کہ نزد اہلِ سنت متواتر است بستارگان تشبیہ دادہ اند و مشبہ بہا بعض سعید اند و بعض نحس پس مشبہ ہم بدین گونہ باشد، فی البدیہہ گفتم کہ این از خوش فہمی طائفہ شما ہست زیراکہ در کلام مخبرِ صادق تشبیہ فقط در ہدایت است بقرینۂ اقْتَدَیْتُم اِهْتَدَیْتُم و ہدایت جملہ ستارگان را بالضرور لازم غیر منفک است لقولہ تعالیٰ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِی ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ چہ ضرورت است کہ تشبیہ در جملہ وجوہ مشبہ بہ باشد تشبیہ بعض وجوہ شائع و ذائع است، قال اللہ تعالیٰ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ کہ درینجا تشبیہ ہمگی در نابودن پدر است نہ در جمیع وجوہ و قَالَ اللّٰہُ مَثَلُ نُوْرِهٖ کَمِشْکٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ کہ درین جا تشبیہ ہمگی باضائت است، نہ بسائر وجوہ وَفِی الْحَدِیْثِ اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَةَ الْبَدْرِ درین جا تشبیہ فقط بہ امکان رویت است نہ در ہیئت مشبہ بہ مرد وارد آمد سکوت کرد افادۃً لکم تحریر نمودم"

وعظ و پند، درس و تدریس، تعلیم و تربیت سے جو وقت بچتا، وہ افتا اور تالیف و تصنیف کے نذر ہوتا، تصانیف میں کئی رسائل رد بدعت میں عالمانہ اور محققانہ سپرد قلم فرمائے ہیں، جن کا ہر لفظ واقفیت عام اور وسعت اطلاع کا آئینہ دار ہے، طرز تحریر نہایت سنجیدہ اور اسلوب بیان انتہائی پاکیزہ ہے، اردو میں آیات الاحکام کی تفسیر اور اس پر مجتہدانہ فوائد و حواشی کا اضافہ آپ کے علمی کارناموں کی جان ہے، آپ کی تفسیر آیات الاحکام کو دیکھ کر اس دور کے علم و تحقیق کے سب سے بڑے قدر شناس امیر الممالک الاجاہ علامہ نواب صدیق حسن خانصاحب والیٔ ریاست بھوپال اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں،

أتانا كتابٌ منكَ عن ورودهِ　　　اضاءت له الدنيا وزالت همومها

شممتُ عبيرَ المسكِ في طيّ نشرهِ　　　فأوجبتُ ايامًا على ان اصومها

الى جناب العلامة الاوحد الفاضل الكلام المجد الاديب الاريب و الحلاحل اللبيب الحامي لسُنن النبي التهامي اخينا مولانا المولوي حافظ محمد عبد العلي النجرامي عامله الله بلطفه السامي وبعد اهداء السلامُ التام وانهاء التحيات والاكرام فالمرفوع الى عالي المقام، سامي المجد و الاحترام انه وصل الى محبتكم مكتوبكم الفخيم مع تاليفكم الكريم بمعرفة الشيخ العلامة مولانا محمد انور على المرادآبادي اوتي الاجر من الله ذي الايادي فقابلته بالتبجيل والتعظيم وتلقيته بالترحيب والتكريم وحصل لمحبكم بوصوله غاية الفرح والسرور لانه متحلي بما يزري قلائد النحور، يا مولانا قد فسّرنا آيات الاحكام من قبل لكن ما اودعتم في تفسيركم هذه من النكات والاسرار فما والله لا سمعت اذني ولا رأت عيني باحسن منها فوالله لقد انشرحت عند مطالعتها القلوب وولّت همومها الصدور والشوق الى لقاء الحبيب نضّر الله ايامه ونشر على هام المجد اعلامه كشوق الروض الى الطلّ والمهجور الى الوصل او كشوق الظمآن للشراب والارض المحلة للسحاب وهذا تشبيهٌ وتخييلٌ والا فشوق المحب والله يفوت التو صيف ويتجاوز التعريف والله جامع المتفرقين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين والسلام بالاكرام، بالبدء والختام"

صدیق...... جمادی الاولی ۱۲۹۲ھ بھوپال

آپ کے علمی تبحر، خداداد قابلیت اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت نے بارہا اس کے مواقع بہم پہنچائے کہ آپ کسی اونچے اور ممتاز عہدہ پر فائز ہو کر دولتِ دنیا حاصل کریں، لیکن آپ نے پروردگارِ عالم سے جو عہد و پیمان دین و مذہب کی خدمت گذاری کا فرمایا تھا، ہمیشہ اس پر قائم رہے، سیم و زر کی تھیلیاں آپ کے سامنے کھولی گئیں، لیکن آپ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، تقرب سلطانی کے عہدے اور مرتبے پیش کئے گئے، لیکن آپ نے التفات نہیں فرمایا، ساری عمر موٹا جھوٹا کھایا اور پہنا، عسرت کی زندگی کو ترجیح دیا، اور خدمتِ خلق و اطاعتِ خالق میں مصروف رہے، بزرگوں کا یہ مقولہ بالکل سچ ہے جو دنیا سے بھاگتا ہے دنیا اسکے پیچھے دوڑتی ہے، بالکل یہی حال حضرت مولانا کا تھا،

واجد علی شاہ کے سن جلوس میں انجم الدولہ مصلح السلطان سفیر شاہی مقرر ہوئے تھے، لیکن کسی خطا کے باعث اس عہدہ سے معزول کر دیئے گئے، اور ریزیڈنٹ کی تجویز کے مطابق نواب محمد خانصاحب عہدۂ نظامت سے سفارتِ شاہی پر مامور کئے گئے، اسی زمانہ میں ایلیٹ صاحب سکریٹری گورنر جنرل لکھنؤ آئے، یہ بڑے علم دوست اور السنۂ مشرقیہ کے دلدادہ تھے، جہاں کسی کتبخانہ کا پتہ پاتے، پہونچتے، اور جہاں کسی صاحبِ علم کی خبر پاتے، ضرور ملتے، نواب محمد خانصاحب کی زبانی

حضرت مولینا عبد العلی صاحبؒ کے علم وفضل کا ذکر سُن کر الیٹ صاحب نے ملاقات کے لئے بے حد اشتیاق ظاہر کیا، اور کرنل رچمنڈ صاحب سے تحریک کی کہ مولینا کو ریزیڈنسی میں بلایا جائے، کرنل صاحب نے نواب محمد خانصاحب سے کہا نواب صاحب نے آپ کے استغنا، اور تقرب سلطانی سے گریز کا حال نیز تحصیلداری سے استعفا، امین الدولہ کے اصرار اور آپ کے انکار کی ساری داستان سنائی، اور کرنل صاحب کو مشورہ دیا، کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک خط مولینا کو تحریر کریں، اور میں قاصد بن کر ان کی خدمت میں حاضری دوں ممکن ہے مولنٰنا قبول کریں، اور ریزیڈنسی کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں، کرنل رچمنڈ نے نواب محمد خانصاحب کی رائے سے اتفاق کیا، اور ذیل کا خط دیکر نواب محمد خانصاحب کو حضرت مولنٰنا کی خدمت میں روانہ کیا،

"غواص بحارِ علوم و دراکِ نکاتِ فہوم عالم یکتی قبیل اصمعی نظیر جامی مولنٰنا المولوی عبد العلی النجرامی سلام محبت التیام قبول باد الحال رئیس نبیل حاکم جلیل عالی جناب معلی القاب سرجان الیٹ صاحب بہادر سکریٹری اعظم حضور نواب گورنر جنرل بہادر لازالت شموس اقبالہ طالعۃ نزول اجلال بدار الحکومت لکھنو فرمودہ اند موصوف را در علوم مشرقیہ لذتے است فراوان وحظے بے پایان ونفس عالیہ آں گرامی قدر ہردم کتب مشرقیہ راجویان، و علمائے مشرقیہ بہ بارگاہ آن والامناقب منزلت عظیم ورفعت جلیل دارند، چون فضیلت و غزارت علم آنجناب بزبان برکت ترجمان نواب محمد خان بسماع مبارک آن حاکم محکم رسیدہ استدعا بلقا فرحت افزائے آن فضیلت دستگاہ بہ وسیلہ کاتب این سطور می فرمایند از اخلاق وصفات ستودہ کہ خاصہ علما ہستند دارد واثق کہ بمقام ریزیڈنسی از قدوم میمنت لزوم مشتاقان زیارت خود را مستحق تشکر سازند۔"

خادم شما:- کرنل رچمنڈ ریزیڈنٹ

حضرت مولانا لکھنؤ ہی میں مولانا انور علی صاحب مرادآبادی رح کے دولت کدہ پر موجود تھے نواب محمد خان صاحب کرنل صاحب کا خط لیکر آئے، ہر چند کہ مولنٰنا کی طبیعت امرار کی صحبت سے نفور تھی، لیکن نواب محمد خان صاحب کے اصرار نے بالآخر ریزیڈنسی تک پہونچا ہی دیا، جہاں کرنل رچمنڈ اور سرجان الیٹ آپ کے لئے ہمہ تن انتظار تھے، مولنٰنا کی تشریف آوری پر دونوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا، اور عزت وتکریم کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا، یہاں بھی کھدر کے کرتے اور کھدر کے پائجامے کی شان قائم تھی، بڑی دیر تک مختلف علمی مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، سرجان الیٹ نے خاتمہ کلام پر نہایت ہی مخلصانہ انداز میں فرمایا، مولانا اگر آپ قبول فرمائیں تو سرکار کمپنی میں آپ کے علم وفضل کے شایان شان عہدہ حاضر ہے، مولنٰنا نے ایک ہلکے تبسم کے ساتھ شکریہ ادا کیا، اور فرمایا کہ فقیروں کو عہدہ و مرتبہ کی خواہش نہیں ہوتی، رب کی رضاجوئی اور خلق کی خدمت ہمارے لئے یہی مرتبہ کیا کم ہے، اس استغنا نے سرجان الیٹ کے دل میں مولینا کی قدر ومنزلت اور زیادہ کردی، اور وہ آپ کی ملاقات سے بہت زیادہ خوش ہوا،

اس دور کے اکابر علما سے آپ سے خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا، مولانا انور علی صاحب مرادآبادی اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی، شاہ پناہ عطار صاحب سلونوی رح مولانا خواجہ احمد صاحب رائے بریلوی کے خطوط اور بعض خطوط کی نقل مولانا کے کتب خانہ میں اب تک محفوظ ہے،

مولنٰنا امیر علی صاحب شہید رح سے بھی معاصرانہ سلسلۂ مکاتبت تھا، آپ نے جب علم جہاد بلند کیا تو حضرت مولنٰنا رح نے بھی شرکت کے لئے تیاریاں شروع کیں، لیکن قبل اس کے کہ آپ اس سعادت کو حاصل فرمائیں، مولینا امیر علی صاحب رح نے جام شہادت نوش فرمایا، مولانا امیر علی صاحبؒ کی شہادت سے عسکر اسلامی کا نظام درہم برہم ہوگیا، اور نہ معلوم کتنے دلوں کو جان بازی کی حسرت

باقی رہ گئی،

علوم میں قرآن وحدیث فقہ پر پوری دسترس حاصل تھی، ادب عربی اور ادب فارسی سے غایت دلچسپی اور شغف تھا، دونوں زبانوں میں قلم برداشتہ لکھتے، اور جو کچھ لکھتے اُسے پڑھ کر بڑے بڑے ماہرین فن سر دُھنتے،

علم وعمل حکمت ومعرفت کا یہ درخشندہ آفتاب ۲۸ رشوال یوم چہارشنبہ ۱۲۹۶ھ کو غروب ہوگیا،

(باقی)

تابعین رض

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؓ بن عبد العزیز، حضرت حسنؓ بصری، حضرت اویسؓ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفرؓ صادق، حضرت محمد بن حنفیہؒ حضرت سعیدؓ بن مسیب، حضرت سعیدؓ بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام اوزاعیؒ، امام مکحول شامی، قاضی شریح وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح ان کے علمی مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت:۔ ۵۰۰ صفحے، قیمت:۔ للعہ

منیجر

تلخیص و تبصرہ

زندگی کی بے کیفی اور اوس کا علاج

ہم مین اکثر طبیعتین ہنگامہ پسند ہوتی ہیں، ایسے طبائع کے لوگ غیر متوقع اور پر خطر حالات کا بڑی خوبی سے مقابلہ کرتے ہین، اس احساس سے ان کو مسرت ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت اہم اور ضروری ہے، اور ان سے بڑے کارناموں کی توقع ہے، اصل یہ ہو کہ انسان ایسی ہی جد وجہد کا متمنی ہوتا ہے، جس کے نتائج جلد برآمد ہون، اسی لئے جنگ میں فتح حاصل کرنا مستقل امن وسکون قائم کرنے سے کہیں آسان ہو طبیعت مین جنگ وجدال کا عنصر دشمن سے برسر پیکار ہونے میں مددگار رہتا ہے، اور ہم اپنے مقصود کے حصول میں غیر متزلزل ارادہ کے ساتھ منہمک ہوجاتے ہین، ہم پہاڑون کی بلند چوٹیون پر بڑے جوش وولولہ کے ساتھ چڑھتے لیکن ہمارا سارا جوش وحوصلہ اس وقت مایوسی سے بدل جاتا ہے، جب پہاڑون کے دوسری طرف بے رونق پہاڑیوں اور چٹیل میدانوں پر نظر پڑتی ہے، وہی پر جوش لڑکا جو اپنی خیالی دنیا مین اپنے قلعہ کو خوفناک محاصرہ سے محفوظ رکھتا ہے، آگے چل کر صرف ایک پریشان حال اور درماندہ تاجر بن کر رہ جاتا ہے، ناکامی سے ہمارے سارے بلند حوصلے فکر وتردد سے بدل جاتے ہیں، پیہم کرنے کا سارا جوش وولولہ بری طرح سے کچل دیا جاتا ہی، تاآنکہ ہم نامرادی کی اوس منزل پر پہونچ جاتے ہین جہان مہمات پر استغنا کے ساتھ صرف مسکرا دیتے ہین، اور ان کو نوجوانوں کے تخیلات سے تعبیر کرنے لگتے ہین،

نوجوانی کی روح کے خاتمہ پر اس کی تازگی اور دلچسپی بس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہوجاتا ہے، نوجوانوں کے لئے ہر بات نئی اور ہنگامہ خیز ہوتی ہے، وہ اپنی خیالی دنیا اور اپنے تصورات میں ولولہ انگیز کارنامہ کا مرکز ہوتا ہے، اور یہ چیز اس کے لئے معمولی معاوضہ نہیں ہوتی، نوجوانوں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے، کہ وہ پُرلطف مہمات سے دوچار ہون گے، چنانچہ وہ غیر معمولی اور پراسرار حالات کے متلاشی اور حیرت انگیز کارناموں کے لئے منتظر رہتے ہیں، لیکن جو لوگ نفسیاتی شباب کے راز سے محروم ہوجاتے ہیں اور اس سے ہمیشہ ناآشنا رہتے ہین، انھیں زندگی مکدر اور بے کیف معلوم ہونے لگتی ہے، اس کے دو نتیجے ہوتے ہین، کچھ لوگ اس پر قابو حاصل کرنے کے بجائے اس سے مضطرب ہوکر پناہ حاصل کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے پھرتے ہین، اور غم غلط کرنے کے لئے تفریح کے مشاغل تبدیل کرتے رہتے ہین انھین عارضی سکون و قرار اور استقلال بھی نصیب نہیں ہوتا، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہین، جو ان حالات سے بددل ہوکر اپنی ذات مین محو اور دنیا سے بے تعلق اور بے حس ہوجاتے ہیں، ان کے لئے کسی چیز میں کشش اور دلچسپی باقی نہین رہ جاتی، اور ان کی ساری توجہ سمٹ کر ان کی ذات میں مرکوز ہوجاتی ہے، ان کے ناقابلِ توجہ احساسات بڑھنے لگتے ہین، اور ہر قسم کی کسک اور درد کو مبالغہ آمیز شکل میں پیش کرتے ہین،

ایسے شخص کی طبیعت کی گرانی اور بے کیفی سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ صحیح طریقہ پر زندگی نہیں بسر کر رہا ہے، وہ جو کرنا چاہتا ہے نہیں کر رہا ہے، یا اوسے معلوم ہی نہیں، کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے، اور زندگی مین اس کو اس کی جگہ نہیں ملی ہے، اس سے بعض وقت شدید قسم کی بددلی پیدا ہوجاتی ہے، اور جس کام کو ہم پسند نہیں کرتے، یا جو ہمارے لئے دلچسپ نہیں ہوتا، اس کا کرنا وبال ہوجاتا ہے، اور اس سے محرومی اور ہزیمت محسوس ہونے لگتی ہے، عموماً انہی چیزوں سے زندگی وبال اور اجیرن ہوجاتی ہے،

ممکن ہے ہماری محرومی کا سبب ہماری جذباتی زندگی کی مایوسیاں یا کسی ناگوار طریقہ پر زندگی کا

جبراً قبول کرنا ہو، یہ بھی ممکن ہو کہ ہمارا حوصلہ اور اندرونی خواہشیں حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہون، اور ان کا خیال ہماری ہزیمت و اضمحلال کا سبب ہو، ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم معمولات کی بندشون مین پھنس کر بے بس ہوگئے ہون، اور ہم مین وہ جرأت نہ ہو، جو اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے، محرومی اور ناکامی ہم کو غمزدہ بنا دیتی ہے، گو ہماری سب خواہشات ہمیشہ ہماری مرضی کے مطابق نہیں پوری ہوسکتین، لیکن ایک ایسی درمیانی صورت ہوسکتی ہے جس سے ہم کافی حد تک مطمئن اور مسرور رہ سکتے ہین،

ہم مین نمایان کام انجام دینے کا حوصلہ و ولولہ ہونا چاہئے، اور نوجوانی کے تخیلات اور تصورات کو خشکی اور حقارت کیساتھ نہ ٹھکرانا چاہئے، کیونکہ یہی تصورات اکثر ان چیزون کی جانب رہنمائی کرتے ہین، جو ہمارے لئے حد درجہ دلچسپ ثابت ہوسکتی ہیں، ولولہ اور حوصلہ ایک ایسا قیمتی عطیہ ہے جس کو دبا دینے سے زندگی کی چاشنی اور دلچسپی ختم ہوجاتی ہے، اسے دبا دینے کے بجائے اس کو بلند اور بہتر شکل میں مناسب راستون پر لگانا چاہئے، بچپن کے کسی حد تک ناقابلِ عمل اور ناپسندیدہ حوصلہ کو سدھار اور سنوار کر جوانی میں اجیرن زندگی کو خوشگوار بنایا جاسکتا ہے، اس سے وہ زندگی جو اب تک بے جان تھی پرلطف اور شگفتہ ہوجائے گی،

آج خوفناک دشمن کی یلغار سے قلعہ کی حفاظت کا سوال ہماری بڑی اکثریت کے سامنے نہین آتا، لیکن بہت سی ایسی باتیں ہین، جو ہمارے جذبۂ شجاعت کو ابھار سکتی ہین، ظلم اور ناانصافی آج بھی دنیا پر مسلط ہے، جہالت، غربت، اور بیماریان آج بھی انسان کے جذبۂ شجاعت کو دعوتِ مبارزت دے رہی ہین، کیونکہ کوئی نہ کوئی ضرور آپ کی امداد کا محتاج ہوگا، سوسائٹی کی کوئی نہ کوئی مفید خدمت آپ ضرور کرسکتے ہین، اس سے آپ بوجھل زندگی کا بار ہلکا کرسکتے ہین،

بوجھل زندگی کا ایک علاج اپنے آپ کو بھلانا بھی ہے، ہماری نصف جنگ اسی وقت سر ہوجاتی

ہے، جب ہم اپنے آپ سے بے فکر ہو کر دوسروں کے لئے غور و فکر کے عادی بن جاتے ہیں، اور اپنے آس پاس کی دنیا سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور ہمیشہ دلچسپ اشخاص اور نئی نئی سرگرمیوں کے متلاشی رہتے ہیں، اسوقت ہماری بوجھل زندگی کی ساری گرانیاں دور ہو جاتی ہیں، اگر آپ اپنے شوق سے سیاحت، قدیم زمانہ کی یادگاروں کی تلاش اور ملک کے نامعلوم حصوں کو دریافت کرنے کی خواہش عقلمندی کے ساتھ رکھتے ہیں، تو یہ چیزیں زندگی کی بے کیفی کی خوشگوار تلافی کر سکتی ہیں،

بے کیف زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک خود ہمارے اوپر ہے بیرونی حالات کو اس کا سبب قرار دینا صحیح نہیں، ہمارا کام بے لطفی اور گرانی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اپنے لطف و تفریح کے اوقات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں، ہم ان کو بہترین مصرف میں لاتے ہیں،؟ یا ہم پر قیود اور پابندیاں ہوتی ہیں؟ یا ہم ان کے اثرات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ؟ یا ہماری بوجھل زندگی کا سبب خود فہمی کی کمی، کاہلی، بے حسی یا شکست پسندی تو نہیں ہے،؟

زندگی کی بے کیفی اور گرانی کا علاج یہ ہے کہ ہم اپنے کو اچھی طرح جانچیں، ہمیں اپنی بے اطمینانی اور بے سکونی کا اصل سبب معلوم کر کے جہانتک ممکن ہو اوس کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس وقت تک مسلسل تجربہ کرتے رہنا چاہئے، جب تک ہم کوئی دلچسپ مشغلہ نہ دریافت کر لیں زندگی میں ہماری آسودگی اور سکون کا دار و مدار ہمارے اوس نظریہ اور رویہ پر ہے جو ہم اپنی ذات کے ماسوا دنیا سے رکھتے ہیں، صبر و بے حسی کی جگہ ہم کو اپنے اندر نوجوانی کا شوق و تمنا پیدا کرنا چاہئے، اور کارآمد و مفید باتیں کرنے کی خواہش کو اپنے اندر ترقی دینا چاہئے،

(ن ص)

مطالعہ سے استفادہ کے اصول

مطالعہ کا بڑا ذریعہ کتب بینی ہے، قابلیت کیساتھ کتب بینی کرنے سے آپ کا مطالعہ بڑے سکون

کیساتھ پایۂ تکمیل کو پہونچے گا، اگر آپ اپنے کو ایک لائق کتب بین بھی تصور کرتے ہیں تب بھی آپ کے لئے ترقی کی گنجائش ہے، جب ذیل اصولوں کی پابندی مطالعہ کے فوائد کو بہت بڑھا دیتی ہے،

کتب بینی کا طریقہ زیر مطالعہ کتاب کے مضمون سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، ......

اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ ایک صفحہ پڑھنے کے بعد یکایک محسوس ہوتا ہے، کہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہے، اس کا خفیف سا بھی خیال دماغ میں باقی نہیں رہ گیا، یا مقرر کی تقریر جاری ہے، اور آپ کا دماغ اس سے کوسوں دور ہے، یہ دونوں باتیں یکساں ہیں، اگر آپ نے اس شخص کی باتیں سُنی ہیں جو آپ سے گفتگو کر رہا تھا، لیکن اس کے مطالب کو آپنے نہ سمجھا تو یہ نہیں کہا جاسکتا، کہ آپ نے اس کا پیام سُنا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد اگر آپ کے دماغ میں مقرر کے پیام کا تصور نہیں ہے، تو پڑھنے کا عمل تو آپ نے ضرور پورا کیا، لیکن اس عمل کا جو اصلی مقصد ہے، وہ پورا نہ ہوا، ہر مصنف ذہن میں ایک اثر پیدا کرنا چاہتا ہے، اسلئے مطالعہ کرنیوالے کا پہلا فرض یہ ہے، کہ پہلے وہ اس کا اندازہ کرے کہ مصنف کیسا اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے،

مختلف موضوعوں پر مختلف کتابوں کا مطالعہ مختلف خیالات و جذبات کے ماتحت ہونا چاہئے اور ان کے پڑھنے کا طریقہ بھی مختلف ہونا چاہئے، مصنف جو کچھ کہنا یا محسوس کرانا چاہتا ہے اس کو سمجھنا اور محسوس کرنا چاہئے، اور مصنف کی ذہنی کیفیت سے ہمنوائی کرنی چاہئے،

مطالعہ کرتے وقت مصنف کی زبان اور طرز ادا سے مانوس ہونا ضروری ہے، ہر نئے موضوع کے مصطلحات سے واقف ہونا اس پر قابو حاصل کرنے کی ضمانت ہے، بہت سی کتابوں میں موضوع زیر بحث کی سرخیاں قائم کر دیجاتی ہیں جن سے بہت مفید رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اگر سرخیاں نہ ہوں تو تفصیلی مطالعہ سے پہلے کتاب پر ایک سرسری نظر ڈال لینا چاہئے، اس سلسلہ میں جا بجا سے تھوڑا بہت پڑھ بھی لینا چاہئے، اس سے گہرے مطالعہ میں بڑی آسانی پیدا ہو جائیگی، اور مضمون واضح ہو جائے گا، کتب بینی کا مقصد موضوع زیر بحث سے واقفیت حاصل

کرنا ہی، صرف ورق گردانی نہین،

کتاب کے ہر حصہ کے خاص نکتون کو بہت اچھی طرح سمجھنا چاہئے، بلکہ ان کو اپنے الفاظ میں لکھ لینا چاہئے، بعض لوگ اس قسم کے خاص جملوں پر خط کھینچ دیتے ہین، لیکن نکتہ کو پوری طور سے سمجھنے کا معیار یہ ہے، کہ اس کو اپنے الفاظ مین ادا کیا جا سکے، ممکن ہے اصل مصنف کی طرح آپ خوبی کے ساتھ اسکے خیال کو اپنے الفاظ مین نہ ادا کر سکیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ اصل مفہوم پورے طور سے ادا ہو جائے، طرزِ ادا کیسا ہی ہو، اگر اس پر آپ کو قدرت نہیں ہے، اور آپ مصنف ہی کے طرزِ بیان کے محتاج ہین، تو پھر آپ نے کافی غور وخوض سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔

مصنف کی ان شہادتون پر پورا غور کرنا چاہئے جن پر اوس کے خیالات کا مدار ہے، اور یہ دیکھنا چاہئے، کہ وہ صرف ایک بات بیان کر کے اس کا متوقع ہے کہ آپ اسکے بیان کو یقین کرین یا اسکی سندین پیش کر کے اپنا بیان باور کرانا چاہتا ہے، یا وہ دوسرے ماہرینِ فن کا حوالہ دیکر انکی سندون پر آپکے اعتماد کا امیدوار ہے، یا حقیقتیں پیش کر کے اپنے خیالات کی صداقت منوانا چاہتا ہے؟ یا وہ متضاد حقیقتیں بھی پیش کرتا ہے اور کیا وہ آپکے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ آپ وہ سب کچھ یقین کر لینا چاہتے ہین، جو وہ کہتا ہے یا اس کا طرزِ ادا آپ کو اسکی مخالفت پر آمادہ کر دیتا ہے؛ اور کیا وہ وضاحت کیلئے تمثیلوں سے کام لیتا ہے، جس سے موضوع تو واضح ہو جاتا ہے لیکن حقیقت کی تائید نہین ہوتی، مطالعہ کے وقت یہ تمام اور اس قبیل کی دوسری باتون کو ذہن میں رکھنا چاہئے، مطالعہ کرنے والا جس قدر مصنف کی خطیبانہ تدبیرون سے واقف ہوتا ہے، اسی قدر مطالعہ میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، اسکی شہادتوں پر غور نہ کرنے سے صرف تمثیل یاد رہجاتی ہے، اور حقیقت فراموش ہو جاتی ہے، اس لئے جو کچھ پڑھا جائے اس کا صحیح اور مرتب خاکہ تیار کرتے رہنا چاہئے، البتہ شاعری، افسانہ اور پر اسرار قصون وغیرہ کے مطالعہ میں چندان اس کی ضرورت نہیں لیکن ان سب کا مطالعہ بھی کسی مقصد ہی کے تحت مین کیا جاتا ہے اسلئے اسکی مختصر یادداشت تیار کر لینا مفید ہے؛

اخبارِ علمیّہ

افریقہ کی مہلک مکھی

آج جب کہ جنگ کی ہولناکیون نے سائنس کی تباہ کاریون کو مرکز توجہ بنا دیا ہے، اور انسانی زندگی کے تحفظ اور ترقی کی جدوجہد کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں رہ گئی، بہت سے ماہرینِ سائنس افریقہ کے دور افتادہ گوشون میں ایک چھوٹی سی مکھی سے برسرِ جنگ ہین، اس مکھی کے زہر ہلاہل کی تباہ کاری جدید ترین بم کے گولوں سے کم نہیں ہے، اس مکھی کا نام ٹٹسی ہے، اس کے زہر سے غنودگی کی بیماری پیدا ہوتی ہے، پہلی بار جولائی ۱۹۰۱ء میں اوگانڈہ میں تقریباً تیس ہزار جانیں اس بیماری کے نذر ہو گئیں، ۱۲ سال میں تقریباً دو لاکھ انسان اس کے شکار ہوئے، اس تباہ کن بلا کو ایک جماعت نے بڑی دشواریون کے ساتھ روکا، اس سلسلہ میں کہین پوری آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل اور کہین نئی آبادی بسائی گئی، اس اہتمام کے باوجود ٹٹسی اب بھی دبی چھپی ہوئی موجود ہے، یہ وسط افریقہ کے تقریباً پچاس اضلاع میں ہے، اس مکھی کا زہر آہستہ آہستہ جسم میں سرایت کرتا ہے، اور خفیف بخار اور دردِ سر کے بعد عام کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، زہر خون میں شامل ہو کر ریڑھ کی ہڈی اور دماغ کو متاثر کر دیتا ہے، مریض نیم پاگل ہو جاتا ہے، اوس کے منہ سے کف خارج ہونے لگتا ہے، اور وہ گھل کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے، مویشیوں کے لئے اس کا زہر نہایت مہلک ہے، ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ مکھی ملک کے بہترین حصہ مین پائی جاتی ہے، اس کی افزایش کے لئے